ناول

سکندر نامہ

از

سلمیٰ صدیقی

ناشر

پنجابی پستک بھنڈار

دریبہ کلاں دہلی ۶

قیمت
تین روپے صرف

(مطبوعہ: دلیؔ پرنٹنگ ورکس، دہلی)

ناول

سکندر نامہ

عرف

قصّہ بدایوں والے سکندر کا

سلمیٰ صدیقی

انتساب

اپنی "اماں بی بی" کے نام
جن کی فرمائش پر یہ قصہ لکھا گیا

دیباچہ

از :- خواجہ احمد عباس

لوگ سمجھتے ہیں۔ زندگی کا چکر بُدھی مانوں کے سہارے چلتا ہے ۔۔ عالم، ودوان، سائنس داں، سیاست داں، آرٹسٹ، دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے اُس کا سہرا ان سب کے سر ہی باندھا جاتا ہے۔

لیکن ایک اور ہستی بھی ہے، جس کا ذکر کوئی نہیں کرتا، مگر جو زندگی کیلئے اتنی ہی اہم ہے جتنا کہ بُدھی مان! وہ ہے بُدھو۔ بے وقوف۔ احمق۔ پر افسوس یہ ہے کہ کسی تاریخ داں یا ماہر معاشیات نے اب تک بُدھو کے ارتقا اور اُس کی تاریخی اہمیت پر روشنی نہیں ڈالی۔ ہاں ناول نویسوں اور افسانہ نگاروں کی ادبی تخلیقوں میں کبھی کبھی بُدھو کے تیکھے اور دل کش نقش اُبھرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

ہسپانوی ناولسٹ سروینٹیز (CERVANTES) نے اپنے لافانی ناول ڈان کوئکزوٹ (DON QUIXOTE) میں سینکو پینزا کا جو کردار پیش کیا ہے۔ وہ دنیا بھر کے بُدھوؤں کے لئے ایک قابلِ رشک نمونہ ہے۔ سینکڑوں برس سے درجنوں زبانوں میں اس کہانی کو پڑھنے والے سینکو پینزا کی حرکتوں پر ہنس رہے ہیں۔ کھلکھلا رہے ہیں۔ بلکہ سر دھن رہے ہیں۔ شیکسپیر کے تو تقریباً

ہر ڈرامے میں کم سے کم ایک بدھو کا کردار تو ضرور ہی ہوتا ہے۔ شیکسپیر اپنے ناٹکوں میں زندگی کی سچائی پیش کرتا تھا۔ اور اس سماجی سچائی کا ایک خاصا بڑا جز وہ بدھو ہے جو اپنی حرکتوں سے سب کو ہنساتا ہے۔ لیکن جو خود زندگی کو بڑی سنجیدہ اور گمبھیر نگاہوں سے دیکھتا ہے۔

ہندوستان میں سنسکرت کلاسیکی ڈرامے میں بھی بدھو ایک اہم کردار ہوتا ہے۔ کالیداس کے ناٹک "شکنتلا" کا بدھو ودوشک کبھی کبھی بڑے پتے کی بات کہتا ہے۔

اردو ادب میں رتن ناتھ سرشار کے "فسانۂ آزاد" کا خوجی سب سے مشہور اور سب سے دل چسپ بدھو ہے۔ یہ وہ اودھ کا سینکو پینزا ہے جو بات بات پر قرولی نکالتا ہے۔ بھٹیارن پر دل پھینکتا ہے۔ جہاز کی ڈیک پر گنڈے چوسنا اور چھلکے سمندر میں پھینکنا اپنا پیدائشی حق سمجھتا ہے، اور باوجود ٹھگنے اور منحنی ہونے کے اپنے آپ کو کسی رستم سے کم نہیں سمجھتا۔ یہ اور بات ہے کہ مار پیٹ کی نوبت آجائے تو چلا اٹھتا ہے "اے حضرت! لڑائی میں یہ ہاتھا پائی کیسی؟" خوجی بدھو ہے۔ مگر وہ اودھ کی مخصوص تہذیب کا آئینہ بھی ہے۔ ایسا آئینہ جس کی سطح ٹیڑھی ہوتی ہے اور جو انسان کی صورت کو تصویر کی بجائے کارٹون کی شکل میں پیش کرتا ہے۔

اور اب سینکو پینزا، ودوشک اور خوجی کی صف میں سلمیٰ صدیقی نے اپنے بدایوں والے "سکندر" کو لا کھڑا کیا ہے۔ میں نے سنا ہے کہ یہ ایک حقیقی جیتا جاگتا کردار ہے۔ صرف تخیل کی تخلیق نہیں ہے۔ لیکن سکندر میں

کلاسیکی بدھو کی تمام خصوصیات موجود ہیں، جن میں سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کو یہ بالکل خبر نہیں ہے کہ وہ بدھو ہے، بلکہ وہ ساری دنیا کو بیوقوف اور بدھو سمجھتا ہے۔

کیا وجہ ہے کہ زندگی میں بھی اور ادب میں بھی بدھو کی حماقتوں پر سب ہنستے ہیں۔ لیکن کوئی اُس سے نفرت نہیں کرتا بلکہ بچے تو بدھو سے بڑا پیار کرتے ہیں۔ شاید اس لئے کہ وہ بدھو ہے، جو عمر میں بڑا یا بوڑھا ہونے پر بھی ایک بچے کا سا مزاج رکھتا ہے۔ جو سلمیٰ کے سکندر کی طرح "مغل اعظم" کو مرغِ اعظم کہتا ہے۔ مگر کبھی جان بوجھ کر جھوٹ نہیں بولتا۔ جو چینی کے برتن توڑتا رہتا ہے مگر کبھی کسی کا دل نہیں توڑتا۔ جو طوائف سے راکھی بندھواتا ہے اور اس کی پروا نہیں کرتا کہ دُنیا اس پر ہنس رہی ہے۔ بدھو وہ ہے جو موقعہ پرستی کی دنیا میں رہتا ہے۔ لیکن خود موقعہ پرستی اختیار نہیں کرتا۔ جو ریاکاری کے ماحول میں بھی بے اختیار سچ بول دیتا ہے۔ جو زبان کا کڑوا اور کھردرا اور دل کا کھرا اور میٹھا ہے۔

بدھو بدھو ہوتا ہے۔ بیوقوف ہوتا ہے۔ احمق ہوتا ہے۔ مگر بدھو پاجی نہیں ہوتا۔ بدھو کمینہ نہیں ہوتا۔ بدھو چوری نہیں کرتا۔ ڈاکہ نہیں ڈالتا۔ بدھو خون نہیں کرتا۔ بدھو فرقہ وارانہ فساد نہیں کراتا۔ بدھو قتلِ عام نہیں کرتا۔ بدھو دیوالی اور شب برات پر آتشبازی بناتا ہے اور اپنے ہی ہاتھ پر پٹاخہ پھوڑ لیتا ہے مگر بدھو ایٹم بم نہیں بناتا۔ بدھو کبھی بڑا آدمی نہیں ہوتا۔ مگر بدھو بُرا آدمی بھی نہیں ہوتا۔ بدھو گاندھی اور لینن اور نہرو نہیں بن سکتا۔ مگر بدھو کبھی ہٹلر اور مسولینی اور اسٹالین بھی نہیں بن سکتا۔

بدایوں والا سکندر سچ مچ اپنی قسمت کا سکندر ہے۔ جسے اپنی سوانح عمری لکھنے کے لئے سلمیٰ صدیقی جیسی انشا پرداز ملی۔ یہ تصویر سلمیٰ نے صرف روشنائی سے نہیں، خلوص اور ہمدردی کے رنگوں سے بنائی ہے۔ اس لئے اس میں دلچسپی اور دلکشی کے ساتھ بڑی گہری انسانیت کا رنگ بھی جھلکتا ہے۔

سکندر نامہ صرف ایک بدّھو کی کہانی نہیں ہے۔ یہ بدّھو دنیا کے سب بدّھوؤں کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس کو پڑھ کر بے اختیار نعرہ لگانے کو جی چاہتا ہے۔

بدّھو زندہ باد!

دنیا کے بدّھوؤ! ایک ہو جاؤ!

شاید اس لئے کہ ہم میں سے ہر ایک کے دل اور دماغ میں ایک سکندر چھپا ہوا ہماری نام نہاد عقل اور سنجیدگی پر ہنس رہا ہے۔

خواجہ احمد عباس

سکندر اور شریف زادیاں

سکندر نام کے ایک بہت مشہور آدمی کا ذکر ہم تاریخ میں پڑھتے آئے ہیں
اُس نے دنیا کو فتح کرنے کا منصوبہ بنایا تھا، اور اُس پر عمل بھی کیا تھا۔ لیکن قدرت
نے اُس کا یہ خواب پورا نہ ہونے دیا۔ اور اس سے پہلے کہ وہ دنیا کو جیت سکتا
موت نے اُس پہ فتح پالی۔ اُس کی زندگی اور موت کی مختصر سی مدت کا بیان خاصا
دلچسپ ہے۔

لیکن میں آج جس سکندر کا ذکر کر رہی ہوں، اُس نے دنیا کو فتح کرنے کا
خواب تو درکنار، کبھی دنیا کو سمجھنے تک کا بھی خیال نہ کیا۔ پھر بھی اس کی معمولی سی
زندگی کی داستان کسی طرح اُس سکندر کی زندگی کی کہانی سے کم دلچسپ نہیں
ہے جس نے دنیا پر حکومت کرنے کی ٹھانی تھی۔

ہمارے ہیرو سکندر کا جنم اُتّر پردیش کے ایک ضلع بدایوں میں ہوا۔ جہاں کے پیڑے کسی زمانے میں بہت مشہور تھے۔ لیکن اب سکندر کی شہرت کے آگے پیڑوں کی شہرت ماند پڑ چکی ہے۔ اور سکندر کا پورا پورا حال جاننے کے بعد ہمیں یہ بھی اندازہ ہوگا کہ نہ صرف بدایوں کے مشہور پیڑوں کی شہرت کو بلکہ دنیا کے بڑے سے بڑے احمق کی شہرت کو بھی سکندر نے ٹھیس پہنچائی ہے۔ بلکہ کبھی کبھی تو ایسا پھیر آپڑتا ہے کہ مانے ہوئے تاریخی بے وقوف کی شہرت کو صرف ٹھیس ہی نہیں بلکہ گولی لگ جاتی ہے اور مشہور ترین بے وقوف بھی سکندر کی "عقلمندی" کے سامنے بے بس اور ہکّا بکّا نظر آتا ہے۔ یوں بھی بے وقوفی اور ہکّا بکّا پن کا چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔ گو سکندر چولی دامن کے رشتے سے بہت آگے بڑھ چکا ہے۔ چولی اور دامن کپڑے کے ٹکڑے ہوتے ہیں۔ اور اُنہیں آسانی سے ناپا جا سکتا ہے۔ لیکن چونکہ بے وقوفی کو ناپنے والا آج تک کوئی فیتہ دریافت نہیں ہو سکا ہے۔ اسلئے سکندر کی حماقتوں کو ہم بھی آسانی سے ناپ تول نہیں سکتے ہیں۔ سکندر وہ مخلوق ہیں جن پر پیدا کرنے والے کو اتنا فخر نہیں ہوگا۔ جتنی حیرت ہوگی۔ لُطف یہ ہے کہ سکندر خود اپنی بے مثل صلاحیتوں سے قطعاً ناواقف ہیں۔ اور ہر دَم بے حد عقلمند ظاہر ہونے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ سکندر کو ایک نظر میں دیکھ کے کسی کو یقین ہی نہیں آسکتا کہ اس معمولی سے آدمی کے سسٹم میں حماقتوں کے ایسے ایسے کل پُرزے چھُپے ہوئے ہیں جو وقت آنے پر کیسے کیسے گل کھلاتے ہیں سکندر کی بے وقوفی سمجھنے کے لئے بڑی سوجھ بوجھ کی ضرورت ہے۔ اُن کی حماقت سستی، گھٹیا، معمولی، یا آسانی سے سمجھ میں آجانے والی نہیں ہے۔ وہ

ایک ایسے مستقل مضمون کی حیثیت رکھتے ہیں جس پر دِل لگا کے ریسرچ کی جائے۔ اور کبھی کبھی خود ریسرچ کرنے والا بھی سکندر کی شخصیت کے آگے سپر ڈال دے یعنی قلم رکھدے اور عش عش کرنے لگے۔

سکندر کی عقلمندی کی داستان کا آغاز خود اُن کی اس کوشش سے ہوتا ہے، جو وہ خود کو ہر دم عقل مند جتانے کے لئے کرتے رہتے ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ وہ خود کو ایک فرد نہیں ایک جماعت تصوّر کرتے ہیں۔ اور کبھی "میں"، نہیں بلکہ ہمیشہ "ہم" کہہ کر بات شروع کرتے ہیں۔ اس "ہم" کا تذکرہ ان گنت بار اس طرح کرتے ہیں کہ ہمیں شُبہ ہونے لگتا ہے کہ اس دُنیا میں سکندر ہی سب کچھ ہیں اور "ہم" کچھ بھی نہیں ہیں —!

تقریبًا تیئیس، چوبیس سال گذرے۔ ایک دِن صبح سکندر ہمارے گھر میں نوکری کے ارادے سے داخل ہوئے تھے۔ اور آج حالت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ خود ہم لوگ یعنی گھر والے بھی سکندر کی اجازت کے بغیر گھر میں داخل ہونے کا حق کھو بیٹھے ہیں۔ سکندر بادشاہ کا تو دُنیا پہ حکومت کرنے کا خواب پورا نہ ہوا۔ لیکن ایک گمنام سا بیوقوف سکندر آج ایک پورے گھرانے پہ حکومت کر رہا ہے۔ اس لئے کہ اُس نے خواب نہیں دیکھا تھا منصوبے نہیں بنائے تھے۔ بستیاں نہیں اُجاڑی تھیں۔ قبریں نہیں بنائی تھیں۔ بلکہ محض اپنی بیوقوفی کے بل بوتے پر دُنیا کے بازار میں اپنی حماقتیں سجائی تھیں۔ اور اسی لئے فاتح ناکام اور احمق کامیاب ہو گیا۔

اس چوبیس سال کی مدّت میں شاید ہی کوئی ایسا روکھا پھیکا دن گزرا ہو

جب سکندر سے کوئی نہ کوئی حماقت بڑے پیمانے پر سرزد نہ ہوئی ہو۔ سکندر اور بیوقوفی ایک دوسرے میں اس طرح گڈمڈ ہو کر رہ گئے ہیں کہ دونوں کو جاننے پہچاننے والوں کو بھی کبھی کبھی یہ مشکل درپیش ہوتی ہے کہ سکندر کہاں ہیں اور بیوقوفی کون ہے؟ یعنی فن کون ہے اور فنکار کیا ہے؟ بڑے آرٹ کی پہچان یہ بتائی گئی ہے کہ اس میں آرٹسٹ کا "خونِ جگر" شامل ہوتا ہے۔ سکندر کا آرٹ اُس منزل پر پہنچ چکا ہے اور کبھی کبھی ان کی احمقانہ حرکتوں پہ دل اس قدر جلتا ہے کہ جی چاہتا ہے کہ اُن کے بڑے آرٹ میں اُن کے خونِ جگر شامل ہونے کا انتظار نہ کیا جائے۔ بلکہ سیدھے سیدھے ان بڑے آرٹسٹ ہی کا خون کر دیا جائے!! اس لئے کبھی کبھی اُن کے آرٹ کی قیمت بہت ادا کرنی پڑتی ہے۔ یعنی اس وقت جب حالات اور مزاج سازگار نہ ہوں۔ اور سکندر کا احمقانہ آرٹ اپنے عروج پہ ہو۔ اور ایسے مواقع اکثر پیش آتے رہتے ہیں۔!

سکندر جس دِن ہمارے گھر ملازم ہوئے، اُس دن انہوں نے اپنی آمد کے سلسلے میں آتے ہی ایک خوب صورت چائے کے سیٹ کی پیالی توڑ ڈالی۔ اور ٹوٹی ہوئی کرچیں اپنے کرتے کے دامن میں بٹور لائے اور سامنے کھڑے ہو کے بولے۔

"یہ دیکھئے کیا ہوا؟"

"کیا ہوا؟" ہم لوگوں نے گھبرا کے دریافت کیا۔

"ہوتا کیا! آپ کے یہاں کے پانی کے نل نے یہ کر دیا۔"

"پانی کے نل کا اس میں کیا قصور؟" کسی نے کہا۔

"اور کس کا قصور ہے صاحب؟ بھلا ہم کیا کرتے .... ہم پیالی دھو رہے تھے کہ نل اس سے ٹکرا گیا .... نل بدلوا دیجئے۔"

غصہ تو ان پر بہت آیا۔ لیکن چونکہ وہ اُن کی پہلی غلطی تھی۔ پھر اُن کے بیان کے مطابق۔ قصور اُن کا نہیں نل کا تھا۔ اس لئے گھر کے سب لوگ چپ ہو رہے۔

لیکن اس دن سے آج تک سکندر کی اُس پانی کے نل سے دشمنی چلی آ رہی ہے۔ جو کم بخت کبھی پلیٹ توڑ دیتا ہے۔ کبھی گلاس چکنا چور کر دیتا ہے۔ کبھی اس قدر سختی سے بند ہو جاتا ہے کہ اسے کھولنے میں سکندر کی انگلیاں چٹخنے لگتی ہیں۔ اور کبھی اس طرح کھُل جاتا ہے کہ بند کرنے میں سکندر کی کلائی تک مڑ جاتی ہے!!۔

سکندر کی زبان بڑی کڑوی ہے۔ اچھا بھلا آدمی اُن کے دو "میٹھے بول" سُن لے تو زندگی بھر کے لئے اُن کا دشمن ہو جائے۔ نئے نوکروں کے ساتھ اُن کا یہ سلوک ہمیشہ گھر والوں کے لئے پریشانی کا باعث رہا ہے۔ اس لئے کہ سکندر خود کو اب ملازم نہیں بلکہ مالکِ مکان سمجھنے لگے ہیں۔ اور نوکر کو نوکر کا بھی نوکر سمجھتے ہیں۔ مشکل یہ آ پڑتی ہے کہ اُن کے اس طور طریقے کی بنا پر کوئی نیا ملازم ہفتہ دس دن سے زیادہ ٹھہرنے پر آمادہ نہیں ہوتا ہے۔

ایک دن سکندر نے کوئی ایسی ہی حرکت کی۔ ایک ملازم کو جو بڑا سیدھا سادا اور نیک سا چھوکرا تھا، ڈانٹ پھٹکار کے گھر سے نکال دیا۔ وہ بڑا محنتی

نوکر تھا۔ اس کے جانے سے گھر کے کام کاج میں بڑی رکاوٹ پڑ گئی۔
سکندر سے پوچھا گیا۔

" بھئی! آخر تم نے اُس اچھے بھلے آدمی کو کیوں نکال باہر کیا؟۔
تم سے کام ہوتا نہیں ۔ اور دوسروں کو تم ٹکنے نہیں دیتے ہو۔ آخر ہمارے
گھر کا کام کیسے چلے گا؟"

سکندر نے حسب عادت گردن کو جھٹکا دیا اور بولے۔

" اُس چھوکرے کو بلائیے اور پوچھئے۔ ہم نے اُسے کہا ہی کیا تھا؟" پھر
سوچ کے بولے " ہم نے تو بس اس سے یہ کہا تھا کہ بھئی تو ہماری پسند کا
کام نہیں کرتا ہے۔ ہم تجھ کو بے حد ناپسند کرتے ہیں۔ پھر تیری یہ
مجال۔ کہ تو ہمارا مقابلہ کرتا ہے۔ بھلا کہاں تو کہاں ہم۔ تو جرور کوئی نیچ جات
کا آدمی ہے۔ ہم ٹھہرے جات برادری والے ۔ ہیں نو۔ تو کوئی کنجڑا، قصائی
اُٹھائی گیرا سا نظر آوے ہے۔ ۔ چل دور ہو ہماری نظر کے سامنے سے ... "

سکندر اب تک حیران ہیں کہ ایسے پیارے پیارے میٹھے بول سُن کر آخر وہ
بیوقوف چھوکرا بھاگ کیوں گیا ... ؟ ۔

ایک بار ایک چھوٹے سے بچے کے لئے ایک آیا کی تلاش تھی۔ کئی آیائیں
آتی اور جاتی رہیں۔ ایک عورت ٹھیک نظر آئی، اُس سے تنخواہ کی بات ٹھیک
نہیں ہو پاتی تھی ۔ سکندر سے کہا گیا کہ الگ لے جا کر اس آیا سے تنخواہ کی
بات چیت ٹھیک ٹھاک کر لیں۔ بولے۔

" کیا کہیں ہم اُس سے؟ "

کہا گیا "کہنا کہ تیس روپے دیئے جائیں گے۔ دونوں وقت کا کھانا اور دونوں وقت کی چائے ملے گی۔ پھٹے پرانے کپڑے ملیں گے۔ اور اگر یہ منظور نہ ہو تو پھر پچاس روپے خشک ملیں گے۔"

سکندر سر کو جھٹکا دے کر آپا کو کچن میں لے گئے اور دو ہی تین منٹ میں مع آپا کے واپس آئے اور بولے۔

"لیجئے صاحب! سب ٹھیک کر دیا ہم نے۔"

پھر آپا کی طرف دیکھ کے مخاطب ہوئے۔

"ہم نے ان سے کہدیا ہے کہ دونوں وقت کی چائے ملے گی۔ دونوں وقت کا کھانا ملے گا۔ پھٹے پرانے کپڑے ملیں گے۔ لیکن پچاس روپے بالکل "خوشک"، ملیں گے۔"

سکندر آج تک کنوارے ہیں۔ شادی کا ارمان اُن کی زندگی کا سب سے اہم پہلو ہے۔ ہر دم، ہر گھڑی، ہر وقت وہ اپنی شادی کے خیال میں گم رہتے ہیں۔ چوبیس سال سے وہ اپنی شادی کی فکر میں مشغول رہتے ہیں۔ کوئی بھی کنواری، بیاہی، بڑھیا، جوان، خوب صورت، بدصورت عورت ایسی نہیں ہے جو ہمارے گھر میں، پڑوس میں، محلے میں، شہر میں، یا سکندر کے وطن میں انہیں نظر آئی ہو، یا جس کا محض انہوں نے تذکرہ سُنا ہو اور اس سے شادی کے لئے آمادہ نہ ہو گئے ہوں۔ اُن کی اس کمزوری سے بہتوں نے فائدہ اٹھایا ہے۔ خاص طور پر سکندر کے رشتہ داروں نے انہیں اس سلسلے میں ہمیشہ بہت ستایا ہے۔ اور زیر بار کیا ہے۔ ہزاروں

بار اُن سے شادی کے وعدے کئے گئے۔ کبھی خود لڑکی نے۔ کبھی لڑکی کے باپ نے۔ کبھی کسی دوست نے۔ اور کبھی بالکل اجنبی راہ چلتے مسافر نے۔! مگر آج تک کسی نے وعدہ پورا نہیں کیا۔ کسی نے شادی نہیں کرائی۔ کسی نے شادی کرانے کے لئے لی ہوئی رقم نہیں لوٹائی۔ کسی نے ایک بار پیسے لینے کے بعد دوبارہ صورت نہیں دکھائی۔ لیکن سکندر کو کسی سے گلہ نہیں ہے۔ گلہ ہے تو اپنی قسمت سے۔ کہتے ہیں۔

"بچارے وہ لوگ کیا کریں! ــ جب ہماری قسمت میں کھوٹ ہے تو کوئی کیا کرے ـــ!"

رشتہ دار بن کر سکندر کو لوٹنا بہت آسان ہے۔ کوئی ایک بار اُن سے دور کی یا نزدیک کی رشتے داری جھوٹی یا سچّی نکال دے۔ سکندر کی باچھیں کھِل جاتی ہیں۔ بٹوہ کھُل جاتا ہے۔ بے حد فاتحانہ نظروں سے ہر طرف دیکھتے ہیں اور بس "رشتے دار" کی خاطر ریشہ خطمی ہو جاتے ہیں۔ ہم میں سے کوئی اگر سمجھاتا ہے کہ

"بھئی! یہ سب لُٹیرے ہیں۔ تمہیں لوٹنے کے لئے آجاتے ہیں"

تو سکندر اُلٹا ہم سب سے روٹھ جاتے ہیں کہ

"صاحب! ہم تو رشتے داروں کو چھوڑیں گے نہیں۔ ہم کماتے کس کے لئے ہیں؟"

اسی رشتے داری کے سبب سے سکندر خود کنگال رہتے ہیں۔ جو کچھ بھی جمع پونجی اُن کے پاس ہوتی ہے، وہ کوئی نہ کوئی ایرا غیرا رشتے دار کا لیبل لگا کے

ان سے جھپٹ لے جاتا ہے۔ کبھی کبھی تو سکندر خود بھی اپنے رشتے دار کو نہیں پہچان پاتے ہیں. لیکن یہ ان کی مروت اور جذبہ رشتہ داری کے خلاف ہے کہ وہ رشتے کی چھان بین کریں۔

کہتے ہیں۔

"صاحب! ہمارا خیال تو یہی ہے کہ اس آدمی کو ہم نے کبھی اپنے خاندان میں نہیں دیکھا ہے۔ نہ اس کا نام کبھی سُنا ہے ...... لیکن۔ آخر اس کو کیا پڑی ہے، جو خواہ مخواہ ہمیں اپنا رشتے دار کہے گا۔ جرور اس میں کوئی بھید ہے"

مطلب یہ ہوتا ہے کہ۔

"جرور اس میں کوئی رشتے داری ہے"

اور پھر اس "بے غرض" رشتے دار کی جی جان سے خاطر کرتے ہیں۔ اُسکو دودھ جلیبی کا ناشتہ کراتے ہیں۔ علی گڈھ کے بسکٹ اس کو تحفے میں دیتے ہیں۔ اس کو ریل کا کرایہ دیتے ہیں۔ ریل پہ سوار کراتے ہیں۔ اور بس۔ ان سب کے بدلے میں چلتے وقت صرف ایک فقرہ کہہ دیتے ہیں۔

"وہ جرا ہمارا خیال رکھئے گا ..... لڑکی شریف ہو ... کھڑکی دروازے کی جھانکنے والی نہ ہو۔ چٹوری نہ ہو"

رشتے دار بڑے زور شور سے اگلے ماہ کے پہلے ہفتے میں اُن کی شادی کرانے کی شرطیہ قسم کھاتا ہے، ریل چلی جاتی ہے۔ سکندر واپس چلے آتے ہیں۔ اور جانے کتنے اگلے ماہ گزر جاتے ہیں۔ وہ رشتے دار پھر کبھی اپنے رشتے دار سے ملنے واپس

نہیں آتا ہے ۔ لیکن سکندر کا ایمان "رشتے" کی اہمیت میں اور بھی مضبوط ہو جاتا ہے ۔

سکندر کو شور و غل ، میلے ٹھیلے اور چہل پہل سے بہت دلچسپی ہے ۔ تیوہاروں کا انتظار بڑی بے چینی سے کرتے ہیں ۔ ہولی ، دیوالی ، عید، بقرعید اور بڑے دن ، سب کا انہیں انتظار رہتا ہے ۔ صرف اس وجہ سے کہ ان موقعوں پر وہ بازار کی دھوم دھام دیکھ سکینگے ۔ تیوہار کی اہمیت اُن کے نزدیک اتنی ہی ہے کہ اُس میں آدمی اچھے کپڑے پہنتے ہیں ۔ اچھا کھانا کھاتے ہیں ۔ ناچتے گاتے اور گھومتے پھرتے ہیں ۔

ناچ گانے سے سکندر کو حد سے زیادہ دلچسپی ہے ۔ اس میں بندر اور بھالو کے ناچ سے لے کر عورت مرد اور لٹو تک کا ناچ شامل ہے ۔ جہاں کہیں کسی ناچنے گانے والی کا پتہ چلے گا ، سکندر سب کام کاج چھوڑ کے وہاں پہنچ جائیں گے ۔ اُن کے خیال میں بازار میں ناچنے گانے والیوں کا بڑا اونچا درجہ ہوتا ہے ۔ وہ کسی قیمت پر کسی ناچنے یا گانے والی کو گھٹیا یا معمولی ماننے پر تیار نہیں ہوتے ہیں ۔

کوئی مانے یا نہ مانے سکندر کو بازاری عورتوں کے ساتھ غیر معمولی ہمدردی ہے ۔ وہ اُن عورتوں کا ذکر اس قدر عزت اور احترام کے ساتھ کرتے ہیں جیسے اپنے گھرانے کی بے حد قابلِ عزت اور پارسا عورتوں کا تذکرہ کر رہے ہوں ۔

کوئی لاکھ سمجھائے ، سکندر کی سمجھ میں کسی طرح نہیں آتا کہ اُن عورتوں

کو سماج میں نیچ سمجھا جاتا ہے۔ وہ حیران ہو کے آنکھیں پھاڑ دیتے ہیں، اور کہتے ہیں۔

"ہم کیسے مان لیں صاحب! کہ چُنّی بائی، گوری جان اور لچھمی بائی بُری عورتیں ہیں .... اُن کے پاس کیا کچھ نہیں ہے ؟ — پھر یہ بھی تو دیکھئے کہ "بچاری" کس طرح آنے جانے والوں کا دل بہلاتی ہیں۔ خاطر مدارات کرتی ہیں — گانا سُناتی ہیں — ناچ دکھاتی ہیں پان کِھلاتی ہیں، اور کتنا خیال کرتی ہیں"

مزے کی بات یہ ہے کہ سکندر اس طرح کی تفریح گاہوں میں کسی بُری نیت یا بُرے ارادے سے نہیں بلکہ صرف "آرٹ برائے آرٹ" کی خاطر جاتے ہیں۔

اُن کی نگاہ ہر چیز پر سیدھی سیدھی اور اوپری پڑتی ہے۔ کسی بھی گوشے کو وہ گہری نظر سے نہیں دیکھتے ہیں۔ اور چونکہ سماج سے لے کر انسان تک دنیا کی ہر شے کی اوپری سطح بہتر اور چکنی نظر آتی ہے۔ اس لئے سکندر کو ہر چیز بہت اچھی اور خوب صورت نظر آتی ہے۔ نہ تو وہ سماج کی دُکھتی ہوئی رگ چھوتے ہیں۔ نہ سماج کی ٹھکرائی ہوئی عورت کا چھپا ہوا زخم دیکھتے ہیں۔ اس لئے اپنے دل پہ بھی کسی طرح کا بوجھ نہیں رکھتے ہیں۔

شہر کی ہر مشہور اور غیر مشہور طوائف کے آستانے پر وہ اس طرح پابندی سے جاتے ہیں جیسے کوئی مقدّس فریضہ ادا کر رہے ہوں — وہ

عورتیں بھی سکندر کا اس طرح سواگت کرتی ہیں جیسے اپنے کسی باپ بھائی بیٹے یا تیمار دار کا انتظار کر رہی ہوں۔

سکندر ان کا گاہک نہیں۔ اُن کا ایجنٹ نہیں۔ اُن کا پرستار نہیں اُن کا خریدار نہیں —!

پھر ڈر کاہے کا —!

اور جہاں بڑے بڑے دولت مند اور رئیس جاتے ہوئے ہچکچاتے ہیں — وہاں غریب اور مفلس سکندر دھڑلے سے چلا جاتا ہے۔ امیر لوگ تو وہاں جاتے ہیں اپنا غم ہلکا کرنے، اپنی جیب ہلکی کرنے — مگر سکندر وہاں پر جاتے ہیں اُن عورتوں کا دُکھ سُننے۔ اُن کا غم ہلکا کرنے —

سکندر اس بازار میں صرف گانا سننے کے لئے تھوڑی ہی جاتے ہیں — وہ تو اُن عورتوں سے اپنی گھریلو باتیں کرتے ہیں — اپنے رشتے کی اور اپنے رشتے داروں کی باتیں کرتے ہیں۔ اپنے دوستوں کی باتیں کرتے ہیں — مہنگائی کی باتیں کرتے ہیں۔ تیوہاروں کی باتیں کرتے ہیں۔ اپنی سوجھ بوجھ کے مطابق سیاست کی بھی باتیں کرتے ہیں —

گانا تو وہ عورتیں خود ہی کبھی کبھار عادتاً ان کو سُنا دیتی ہیں تو سکندر سن لیتے ہیں — ورنہ وہ تو محض اُن کے دُکھ سکھ کی باتیں سُننے وہاں پہ گئے تھے — کسی بُری نیت سے وہ تھوڑی گئے تھے۔

ایک بار رکشا بندھن کے تیوہار کے موقع پر سکندر صبح ہی سے خلاف عادت کام کاج بہت تیزی سے کر رہے تھے۔ گھر والے حیران تھے کہ آخر ماجرا کیا ہے۔!

پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ۔

"آپ کو نہیں معلوم آج راکھی کا تیوہار ہے۔ ہمیں جرا جانا ہے ہماری دعوت ہے آج"

پوچھا گیا۔

"کہاں جانا ہے تمہیں۔ کہاں دعوت ہے؟"

بہت فخر سے مسکرائے اور بولے۔

"وہ آج جرا...... لچھمی بائی کے ہاں جانا ہے..... راکھی بندھوانے...."

سکندر ایک دن کمرے کی صفائی کر رہے تھے۔ جھاڑن سے میز کرسیاں پونچھتے پونچھتے اُن کی نظر دیوار پر لگے ہوئے ایک کیلینڈر پر پڑ گئی۔ وہ ایک بڑا خوب صورت رنگ برنگا کیلینڈر تھا۔ کسی دریا کے کنارے گھنے گھنے پیڑوں کے نیچے پانچ چھ خوب صورت خوب صورت سجی سجائی عورتیں ناچ کا پوز دے رہی تھیں۔

سکندر چپ چاپ اُس منظر کی دل کشی میں کھو گئے۔ پھر میری طرف دیکھ کے بولے۔

"دیکھئے۔ ڈینس (ڈانس) ہو رہا ہے"

"ہاں" میں نے لاپروائی سے جواب دیا۔
تھوڑی دیر تک وہ کیلینڈر کو ـــ غور سے دیکھتے رہے اور پھر بولے ـ

"میرے خیال میں تو یہ سریچھ جادیاں (شریف زادیاں) ہیں"
پھر بڑے احترام سے وضاحت کرتے ہوئے بولے۔
"طوائفیں ہیں شاید"
ایک بار سکندر میرے ساتھ دہلی آرہے تھے۔ وہ سامان لے کے پہلے ہی اسٹیشن جاچکے تھے۔ جب میں اسٹیشن پہنچی تو ٹرین آنے ہی والی تھی ـ سب نے اِدھر اُدھر سکندر کی تلاش میں نظریں دوڑائیں۔ سکندر پلیٹ فارم کے دوسرے کنارے سے قلیوں کے ساتھ ساتھ جلدی جلدی میری طرف بڑھنے لگے۔ جب دس بارہ قدم کے فاصلے پر رہ گئے تو اچانک ٹھٹھک کے رُک سے گئے اور برابر میں کھڑی ہوئی ایک عورت سے مخاطب ہوئے ۔

"ارے بائی تم کہاں؟"
میں نے اُن خاتون کا جائزہ لیا۔ وہ ادھیڑ عمر کی ایک بڑی لمبی چوڑی سے جھجک جھگڑالو سی عورت نظر آتی تھی۔ میلی سی پیلی دھوتی پہنے ہوئے تھی ۔اور ایک بیڑی کو اپنے پنجے میں دبوچے ہوئے منہ سے دھواں نکال رہی تھی ۔
ٹرین آگئی تھی۔ جلدی جلدی سامان وغیرہ رکھا گیا۔ اور جب گاڑی

چلی تو میں نے ذرا سخت لہجہ میں سکندر سے کہا۔

"یہ کون بیہودہ سی عورت تھی؟"

سکندر نے حیرانی سے آنکھیں پھاڑ کے کہا۔

"ارے —! توبہ کیجئے بی بی —! وہ بیہودہ سی عورت کیوں ہونے لگی وہ تو مدار گیٹ (علی گڑھ کا مشہور طوائفوں کا محلّہ) کی بیلا بائی تھیں.... ابھی ابھی چھ ۶ مہینے کی جیل کاٹ کے آرہی ہیں"

سکندر کے لہجے میں ایسی عزت تھی مدار گیٹ کی بیلا بائی کے لئے جیسے وہ کوئی بڑی ہی شریف، باعزت، سوشل ورکر تھیں اور قومی خدمات کے سلسلے میں جیل کاٹ کے آرہی تھیں ؛

سکندر فلم دیکھنے گئے

کبھی کبھار سکندر فلم دیکھنے بھی چلے جاتے ہیں۔ ویسے فلم دیکھنے کا شوق ان کو ذرا کم ہی ہے۔ جب کسی تصویر کی بہت تعریف سُنتے ہیں تو جاتے ہیں۔ لیکن جب فلم دیکھ کے آتے ہیں تو دو تین دن تک اسی فلم کے ماحول اور ڈائیلاگ میں کھوئے رہتے ہیں۔ پچھلے سال اسی طرح کوئی فلم دیکھ آئے اور صبح سے خلاف معمول چپ سے تھے۔ ہاں۔ آتے جاتے۔ جھاڑو دیتے دیتے۔ برتن دھوتے دھوتے۔ کبھی کبھار ہاتھ روک کے مُنہ ہی مُنہ میں کچھ بڑبڑاتے، کبھی مسکراتے۔ کبھی افسوس سے سر ہلاتے، کبھی خلا میں اس طرح ہاتھ کو نچاتے گویا جو کچھ بھی ہوا اسکی ذمہ داری ان پر کسی طرح عائد نہیں ہوتی ہے۔ اور جیسے خدا سے مخاطب ہو کے کہتے ہوں۔

'مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو
جہاں تیرا ہے یا میرا؟'

جب سکندر پہ یہ کیفیت طاری ہو جائے تو سمجھ لینا چاہیئے کہ دورہ شدید ہے اور جب تک مریض کا پورا حال نہیں پوچھا جائے گا افاقہ ممکن نہ ہو گا۔ جب سکندر چائے کی ٹرے لے کر میرے کمرے میں آئے، اور بڑے میز پہ رکھ کے ایک طرف کھڑے ہو گئے تو میں سمجھ گئی کہ اب کچھ وقت ان کی نذر کرنا ہی پڑے گا۔ میں نے پوچھ ہی لیا۔

"رات کونسی فلم دیکھی"
سکندر کھل گئے۔ آگے بڑھ کے بڑے گمبھیر لہجے میں بولے۔
"مرغِ اعظم دیکھ آئے ہیں"
"کیسی لگی تمہیں فلم؟"

"ارے بی بی ... کیا بتائیں ہم ..... عجیب فلم تھی ... وہ جو کسی نے کہا ہے کہ قسمت کا لکھا پورا ہوتا ہے۔ تو بچاری انارکلی کا مقدر کا لکھا پورا ہوا ..."

"بھئی! یہ انارکلی کون تھی؟" میں نے قصّے کو طول دیتے ہوئے کہا۔
اب سکندر موڈ میں آچکے تھے ۔ آرام سے نیچے قالین پر بیٹھ گئے اور بولے۔

"ارے بی بی .....! آپ کو انارکلی کے بارے میں کچھ پتہ ہی نہیں۔ اور لوگ باگ تو کہیں ہیں۔ کتابوں میں اُس کا قصّہ لکھا ہے۔"

"بھئی! میں کتاب ذرا کم ہی پڑھتی ہوں۔ تم تو بتاؤ۔ یہ قصّہ کیا ہے آخر؟"

"قصّہ صاف ہے۔ مرغِ اعظم کے دربار میں ایک باندی تھی۔ مرغِ اعظم کی دیکھا دیکھی لوگ باگ اُس کو انار کلی کہنے لگے۔ ایک دن وہ سارے عالم (صاحبِ عالم) کے سامنے آگئی۔ اور وِن سے (اُن سے) محبت کرنے لگی .... مرغِ اعظم کے ڈر سے کوئی ڈاکیہ تو اس کا خط سارے عالم تک پہنچانے پہ راضی نہ ہوا ہوگا تو انار کلی اپنا خط لکھ کے، ایک پھول میں بند کر کے، دریا میں ڈال کے بیٹھ رہی اور گانے لگی کہ:-

نہ دیکھا نہ بھالا ؛ تیری جھوٹی کہانی پہ ہم بہت روئے۔

کرنا خدا کا یوں ہوا کہ سارے عالم کی نظر پڑ گئی پھول پہ۔ اور وِنوں نے (انہوں نے) پھول جو اُٹھایا تو اس میں سے نکلا خط۔ بس پھر کیا تھا۔ سارے عالم اپنے باپ مُرغِ اعظم کے خلاف ہو گئے۔ ادھر مرغ اعظم بھی ٹھہرے ایک ہی جِدّی آدمی۔ بس باپ بیٹے میں ٹھن گئی۔ باپ آپ کو چیخے چلائے۔ بیٹا آپ کو۔ اُدھر انار کلی اور اس کی ماں نے شور مچا دیا۔ شور و غل سے مرغ اعظم کو اور بھی "جِد" پڑ گئی اور انہوں نے حکم دے دیا کہ انار کلی کو "جندی" چُنوا دیا جائے۔"

"پھر؟ پھر کیا ہوا؟" میں نے ذرا حیرت کا مظاہرہ کیا۔

"ارے ہوتا کیا صاحب! سارے تماس بین رونے لگے کہ بادشاہوں کے چکّر میں بچاری لونڈیا کی جان مفت میں چلی گئی۔ اچھی بھلی سکل صورت کی تھی... کہاں جا کے دربار میں سارے عالم کی جان کو آ گئی۔ کنیز تو یوں ہی ٹھہری۔ بھلا

پوچھو تو سہی — اسے کس نے کہا تھا کہ اپنی جات برادری کو چھوڑ کے شاہی دربار میں گھس جائے۔ ارے اپنی جات میں دیکھتی کسی برابر والے کو تو ..... ساری بیاہ بھی ہو جاتا اور جان بھی بچ جاتی — مگر وہ جو کہا ہے کسی نے کہ عورت جات تو وہی کرے ہے جو اُس کا جی چاہے ہے "

" پھر —؟ " میں نے پوچھا " تو پھر کیا انار کلی کو جندی چُنوا دیا مرغِ اعظم نے ؟ "

سکندر درگزر کے انداز میں بولے۔

" ہم تو یہی سمجھے تھے صاحب کہ انار کلی اب نظر نہ آئے گی، وہ تو گئی کام سے پر شاباش ہے مرغِ اعظم کو۔ دربار میں موت کا حکم دیا۔ اور پھر جو ہم نے دیکھا تو کھڑے ہیں سُرنگ میں — اور انار کلی الگ کھڑی ہے .... ہم تو جانیں کہ جان بخشی کر دی اس کی ..... بس اتنا ضرور اس سے مرغِ اعظم نے کہا کہ " لڑکی! جا ہم نے تیری جان بخشی کر دی۔ اب تو یہاں سے نکل جا اور پہنچ جا سیدھی کسی مُغل سرائے (محل سرا) کو "

انار کلی کے پورے قصے میں سکندر کو یہی اعتراض تھا کہ اس بیوقوف چھوکری نے سخت حماقت کی تھی کہ بادشاہ کے بیٹے سے عشق کر بیٹھی۔ سیدھے سیدھے اپنی جات برادری والے میں سے کسی آدمی کا ہاتھ پکڑ لیتی ..... اور اس جات برادری کا تذکرہ کرتے ہوئے سکندر کا لہجہ کچھ ایسا ہو جاتا تھا، جیسے وہ خود ہی انار کلی کی جات برادری والوں میں سب سے زیادہ موزوں فرد ہوں "

دلیپ کمار کی اداکاری کے اب بہت قائل ہو گئے ہیں۔ پہلے نہیں تھے۔ اور جب سے مُغلِ اعظم میں اس نے انار کلی سے عشق کیا تھا، خاصے اس سے ناراض رہنے لگے تھے۔ لیکن ایک دن پکچر ہاؤس سے لَوٹے تو بہت ہی خوش تھے۔ اور دلیپ کمار کا تذکرہ کرتے تو اس طرح جیسے اپنی جات برادری کی عورت سے عشق کا تذکرہ کر رہے ہوں۔ اور جیسے انہوں نے اس کا پہلا جُرم معاف کر دیا ہو۔ بولے۔

" صاحب! کیا ایکٹنگ کیا ہے دلیپ کمار نے اس فلم میں ؟ "

" کس فلم میں ؟ "

" ارے اُسی کولن ہور (کوہِ نور) میں۔ کیا فلم بنا ہے کہ دس بار دیکھو اور جی نہ بھرے ..... پھر گانے تو ایسے گائے ہیں کہ پیسے وصول ہو گئے۔ ایک مشہور شہیر (شعر) تو ایسا گایا ہے کہ جو سنتا ہے۔ واہ واہ کرتا ہے۔ جنگل میں رات کے بخت (وقت) گاتا ہے کہ

آج کی رات چاند اور ستاروں کا ملن ہوگا۔ اور مسکراتا رہیگا
جبین پہ آسمان آج کی رات۔

دوسرے موکھے (موقعے) پر گاتا ہے۔

لوگ باگ پیار کی یہ دیکھیں یہ جادوگری۔ سبز پری کو اٹھالایا
گلپھام ... "

سکندر شاعری کے سلسلے میں کسی ردیف، قافیے، وزن یا بحر کے قائل نہیں ہیں۔ اُن کے دل کو تو جو الفاظ شعر میں بھا جاتے ہیں، اُن کو اُلٹ پلٹ

کے کسی نہ کسی طرح اپنی ضرورت اور سوجھ بوجھ کے مطابق ترتیب دے لیتے ہیں۔

اکثر اوقات اپنی کسی نہایت بے معنی اور احمقانہ بات کے ثبوت میں بطور مثال کوئی شعر پیش کرتے ہیں۔ مثلاً ایک دن باورچی خانے میں بیٹھے دوسرے نوکروں سے کچھ امیری، غریبی کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے بہت سوچ بچار کے بولے۔

"بھائی بات گے ہے کہ امیر امیر ہے۔ گریب گریب ۔۔ دونوں کو میں (قومیں) ایک دم الگ الگ ہیں۔ امیروں کا کیا ہے۔ سیر تپھریح میں اپنا بخت (وقت) گزار دیتے ہیں۔ رہے گریب تو اُن کی بھی گجر ہو ہی جاتی ہے۔ وہ جو کہا ہے کسی ساہر (شاعر) نے کہ ؎

جب وقتِ تنہائی ہوتی ہے!

ہم اس طرح گزارا کرتے ہیں!!!"

جانے کس بھلے آدمی کے شعر کے گلے پہ چھُری پھیر کے وہ اطمینان سے حُقّہ گڑگڑاتے ہوئے باورچی خانے سے نکل گئے ..... ایک دن گرمیوں کی رات میں گرمی اور مچھّروں سے عاجز سکندر کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ اور وہ صحن کے ایک گوشے میں اپنی کھاٹ پہ کبھی اُٹھ رہے تھے کبھی بیٹھ رہے تھے۔ میرا اُدھر سے گزر ہوا۔

میں نے پوچھا۔

"کیا بات ہے سکندر! سوتے کیوں نہیں ہو؟"

بولے کہ۔

"کیا بتاؤں بی بی . . . . گے مچھر سونے ہی نہیں دیتے ہیں۔ گرمی سے نیند الگ نہیں آرہی ہے — وہی مضمون ہوگیا ہے جو کسی ساحر شاعر نے کہا ہے کہ ؎

کجا (قضا) کا تو دن ہم نے مکرر (مقرر) کر دیا ہے

پھر تجھے نیند کیوں نہیں آوے ہے !!!"

کڑاکے کی سردی کے دنوں میں کوئی فلم دیکھ کے آئے تو بہت ہی متاثر معلوم ہوتے تھے۔ بولے۔

"صاحب! یہ فلم کے ایکٹر اور ایکٹرانیاں بھی جانے کس مٹی کے بنے ہوئے ہیں — یہ زوروں کا جاڑہ پڑ رہا ہے۔ دانت سے دانت بج رہا ہے۔ اوپر مینھ پر مینھ پڑتا جاوے ہے اور دونوں گا رہے تھے مجے مجے سے کہ ؎

جندگانی بھر نہ بھولے گی یہ برسات کی رات

ایک حسینہ سے اچانک ملاقات ہو گئی

کاش خدانخواستہ — وہ تو کہو — خدا کو اُن کی جندگانی منجور تھی.. اور نہیں تو — جو ہو جاتا المونیہ (نمونیہ) تو کیا ہوتا؟"

گیتا بالی کی کوئی فلم ایسی نہیں ہے جو سکندر نے نہ دیکھی ہو۔ پوری ہندوستانی فلم انڈسٹری میں اگر کسی ایکٹریس کے وہ قائل ہیں تو صرف گیتا بالی کے۔ سکندر نے گیتا بالی کو سب سے پہلے فلم "سہاگ رات" میں دیکھا تھا اور اسی وقت سے سکندر اس کے بالکل گرویدہ ہو گئے تھے۔ میں نے پوچھا۔

" بھئی! آخر ایسی کیا بات ہے گیتا بالی میں جو دوسری ایکٹریسوں میں نہیں ہے "؟

وہ بولے ۔

" آپ سمجھتی نہیں۔ اُن میں (گیتا بالی میں) کیا کیا کھوبیاں (خوبیاں) ہیں - ارے صاحب! ایسی اچھی عادت کی ہیں وہ کہ کیا کہیں ہم - بڑی سیدھی سادی طبیعت ہے اُن کی ـــ شان اور غرور تو ان میں نام کو نہیں ہے - ہم تو صاحب! بس " سوانگ رات " دیکھتے رہے اور واہ واہ کرتے رہے - بھکاری کی طرح رہتی ہیں۔ بچاری کے پاس پہننے کو کپڑے نہیں کھانے کو روٹی نہیں، رہنے کو گھر نہیں ـــ پر کیا مجال جو سکایت کا حرف مُنہ پہ لائیں - بڑی گریبنی طبیعت کی ہیں۔ جیسا روکھا پھیکا کھانے کو دے دیا، کھوشی کھوشی کھا لیا ـــ جیسا موٹا جھوٹا پہننے کو دے دیا پہن لیا۔ بس صاحب ہم تو اس بات کے قائل ہو گئے ہیں ـــ دوسری ایکٹرسوں کی بات الگ ہے بڑی دماگ دار (دماغ دار) ہوتی ہیں وہ - کیا ہم نے دیکھی نہیں ہیں اُن کی فلمیں - ہر بات پہ جھگڑا - ہر چیز پہ نخرہ "

غرضیکہ گیتا بالی کو ایک فلم میں سادہ مزاج بھکارن کے روپ میں دیکھ کے سکندر نے دل ہی دل میں بڑے بڑے ہوائی قلعے تعمیر کر لیئے اور ہر دم اس فکر میں رہتے تھے کہ کسی طرح اُس غریب بھکارن کے کام آسکیں -

کرنا خدا کا یوں ہوا کہ اُنہیں دنوں سکندر کے دانت میں درد شروع

ہوگیا۔ اور ایک دن جب کہ وہ کسی ڈاکٹر کی تلاش میں تھے، تو اُن کو کسی نے بتایا کہ گول مارکیٹ میں ایک ڈینٹسٹ ہیں "ڈاکٹر بالی"، اُن سے ملیں اور علاج کرائیں ۔!

سکندر ڈاکٹر بالی کا نام سن کے کھل اُٹھے۔ اور اُنہوں نے دل ہی دل میں طے کر لیا کہ یہ ڈاکٹر صاحب گیتا بالی کے والد بزرگوار ہیں ــــــ اور غربت سے تنگ آکے ڈاکٹر بن بیٹھے ہیں ۔ اور اُن کے ذریعے سے دانت کے درد کا نہیں تو کم سے کم دل کے درد کا علاج تو ہو ہی سکے گا۔ چنانچہ سیدھے سیدھے وہ ڈاکٹر بالی کے مطب میں گھس گئے۔ ڈاکٹر نے اُن سے پوچھا۔

"کہئے کیسے آنا ہوا ؟ ۔ دانت میں کیا تکلیف ہے آپ کے ؟"

سکندر نے کہا

"اطمینان رکھئے ۔ دانت کا علاج بھی ہم آپ ہی سے کرائیں گے۔ لیکن پہلے یہ پھرمائیے . . . . کہ وہ کہاں ہیں ؟"

"وہ کون ؟" ڈاکٹر صاحب نے پوچھا ۔

بولے "آپ کی صاب جادی "

ڈاکٹر صاحب نے غصیلی نگاہوں سے دیکھا اور گرج کے پوچھا ۔

"ہوش تو ٹھکانے ہیں مسٹر آپ کے۔ میری صاحبزادی کا نام لیا آپ نے تو گولی مار دوں گا آپ کو "

سکندر بولے " واہ صاب دا۔ ہم نے جرا پوچھ لیا دِن کو تو آپ یوں چیخنے لگے اور سارے شہر میں لوگ یاگ دِن کے چرچے کرتے ہیں تو آپ سب کو گولی ماریں گے "

ڈاکٹر صاحب اس بات پر چکرائے اور سمجھ گئے کہ خرابی سکندر کے دانت میں نہیں دماغ میں ہے۔ پھر بھی موٹی عقل کے آدمی تھے، بات کی تہہ تک پہنچنے میں دیر لگ رہی تھی اُن کو۔ آخر کار سکندر نے خود ہی بات صاف کی اور پوچھ ہی بیٹھے۔

"تو کیا گیتا بالی آپ کی صاب جادی نہیں ہیں؟"

اب ڈاکٹر صاحب کی جان میں جان آئی پھر بھی وہ سکندر کی جان بخشی پہ رضا مند نہ ہوئے۔ اور سکندر کے دانت پہ اپنی نظریں لگائے ہوئے تھے۔ آس پاس کے لوگوں نے سکندر اور ڈاکٹر کا جھگڑا ہوتے ہوئے دیکھا تو صلح صفائی کرانے لگے۔ اور بڑی مشکلوں سے پانچ روپے اور ایک دانت کا نذرانہ لے کر ڈاکٹر صاحب نے سکندر کا پیچھا چھوڑا۔

اُس دن سے گیتا بالی کا نام سُنتے ہی سکندر کو دانت کا درد لاحق ہو جاتا ہے اور اس طرح ہمیں بھی گیتا بالی کی گریب طبیعت اور غریبیٔ کے قصّے سُننے سے نجات مل گئی ہے:

سکندر، سائیکل اور دیوان جی

سکندر کو ہمیشہ یہ شبہ رہا کہ اُن کی صحت خراب رہتی ہے اور اس لئے وہ عام طور سے ڈاکٹروں کی تلاش میں رہتے ہیں۔ علی گڑھ میں جان پہچان کے ڈاکٹروں کی وجہ سے اُنہیں میڈیکل ایڈ کی طرف سے بڑا اطمینان رہتا تھا۔ جب وہ دہلی آئے تو اپنے اُلٹے سیدھے بستر کے ساتھ ساتھ اپنے امراض کی پوٹلی بھی اُٹھاتے لائے۔ دہلی میں ان کو علاج کی وہ آسانیاں اور سہولتیں کہاں میسر تھیں جو علی گڑھ میں تھیں، اس بات سے سکندر بہت دُکھی رہنے لگے۔ اور ایک دِن کہنے لگے۔

"ارے صاحب! علی گڑھ کی بھی کیا بات ہے۔ علاج اور ڈاکٹری کا تو وہاں بڑا آرام ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک یہ ہے آپ کی دہلی۔ یہاں تو بیمار پڑنے سے بھی دل ڈرے ہے۔ کل رات ہمیں بدہضمی ہو گئی تھی۔ ہم تو سمجھے کہ ہم کو ہو گئی "کالکے"

دکالرے، کی بیماری . . . . پر وہ تو خدا کو جندگانی منجور تھی ہماری، کہ آپ ہی آپ ہم ٹھیک ہو گئے . . . . ورنہ ہم تو یہاں مر جاتے، جب بھی کسی ڈاگٹر کو فکر نہ ہوتی "

پھر بڑی حیرت سے بولے ۔

"کاس! کھُدا نخواستہ کوئی بیمار پڑے تو بس علی گڑھ ہیں۔ لیکن وہ جو کسی نے کہا ہے کہ قسمت کے آگے کسی کی نہ چلے ہے۔ تو یہ تو وہی مجمون ہو گیا کہ مجبوری کا نام شکریہ ہے "

بیماریوں میں وہ سب سے زیادہ زکام سے ڈرتے ہیں۔ اور اُسے بڑے خوف سے "جوکھام" کہتے ہیں۔ ایک بار سردی کے دنوں میں اُنہیں کوئی ضروری خطرے کے علی گڑھ سے دہلی جانے کو کہا گیا سکندر نے صاف منع کر دیا کہ ۔

"صاب! ہم نہیں جائیں گے۔ یہ زوروں کا جاڑا پڑ رہا ہے ۔ اگر ہم دہلی گئے تو پانی بدلنے سے ہمیں جوکھام کا مرض پیدا ہو جانے کا اندیشہ پیدا ہو جائے گا "

سردی سے بہت بچتے ہیں ۔ اور اکتوبر سے لے کر مارچ تک ایک مفلر اپنے سر اور کانوں کے گرد لپیٹے رہتے ہیں۔ کیسا ہی کوئی موقعہ آن پڑے، سکندر پانچ ماہ تک اس مفلر کو کسی قیمت پہ اپنے سر اور کانوں سے الگ کرنے پر تیار نہیں کئے جا سکتے۔ پانچ ماہ تک یہ مفلر باقاعدہ سکندر سے چپک کے رہ جاتا ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ اکتوبر سے مارچ تک کی ہوائیں تو بس چلتی ہی ہیں سکندر کو ستانے کی خاطر۔ کبھی کبھی ہواؤں کی شان میں وہ ایسے الفاظ کہتے سُنے گئے ہیں، جو وہ شاید اپنے

کسی بدترین مخالف سے بھی نہ کہتے۔ اس مفلر کا بھی عجیب حال ہے۔ یہ کبھی وقت سے پہلے اُتارا نہیں جاتا اور وقت گزرنے کے بعد اُس کی حالت ایسی نہیں رہ جاتی کہ اُتار کے رکھا جا سکے۔ وہ تو سکندر پہ سے اُترتا ہے، تو سیدھے کوڑے کرکٹ کی بالٹی میں جاتا ہے۔ سکندر سردی کی مدت ختم ہونے پر اس مفلر کو اس طرح اپنے سے الگ کرتے ہیں جیسے ہم اور آپ کیلے کا چھلکا اُتارتے ہیں۔ یا سانپ اپنی کینچلی اُتار پھینکتا ہے۔ چنانچہ رُت بدلنے کا اندازہ محض کیلینڈر سے نہیں، کبھی کبھی سکندر کے مفلر کے اُترنے چڑھنے سے بھی لگایا جا سکتا ہے۔

کچھ تو سکندر سُنتے بھی اونچا ہیں۔ اور کچھ اُس مفلر کی وجہ سے بھی سُننے سے معذور رہتے ہیں۔ اس سلسلے میں آئے دن طرح طرح کے لطیفے ہوتے رہتے ہیں مثلاً اُن سے کہا جاتا ہے۔

"بھئی سکندر! دھوبی کتنے دن سے نہیں آیا ہے؟"

جواب ملتا ہے۔

"واہ صاحب واہ۔ گڑ بھی تو ابھی پرسوں ہی پکی تھی"

کوئی کہتا ہے "ہمارا بستر چھت پہ لگانا"

سکندر جواب دیتے ہیں "خط تو ہم ڈال بھی آئے"

کسی نے کہا "بازار جاؤ تو گزک لیتے آنا"

سکندر نے لاپروائی سے حقہ پیتے ہوئے جواب دیا۔

"گنے کا رس آج کل کہاں ملے گا؟"

ایک دن میں نے اُن سے کہا "رات کو تم نے میری صُراحی کیوں

نہیں بھری ؟"

بڑے فلسفیانہ انداز میں گویا ہوئے۔

"ہم نے تو آج تلک آپ کی بُرائی نہیں کی"

عجیب بات یہ ہے کہ عام طور پر سکندر ذرا کم ہی سُنتے ہیں اور اگر بقول اُن کے کوئی "رگڑے" (جھگڑے) کا کام اُن کے سپرد کر دیا جائے جب تو بالکل ہی بہرے پٹ بن جاتے ہیں۔ لیکن جونہی کوئی بازار جانے کا نام لے دے تو سکندر چاہے زمین کی ساتویں تہہ میں ہوں فوراً سُن لیں گے۔ اور بازار جانے کے لئے تیار ہو جائیں گے۔ جانے کسی دیو کی جان کسی طوطے میں بستی تھی کہ نہیں۔ لیکن سکندر کی جان تو بازار میں بستی ہے۔ وہ ہر وقت اس فکر میں رہتے ہیں کہ کوئی نہ کوئی بازار کا کام کسی نہ کسی طرح نکال لیں۔ ایک گلاس پانی کوئی گھر میں مانگ لے اُن سے تو لگتا ہے کہ ہمالیہ کی چوٹی پر چڑھنے کی فرمائش کر دی گئی ہے۔ لیکن اگر بازار کا کام ہو تو سکندر چاہے گھر کے کسی بھی حصے میں ہوں، ایک جھپاکے میں الٰہ دین کے چراغ والے دیو کی طرح سامنے آ جاتے ہیں۔ دراصل سکندر کی تمام تر دلچسپیوں کا مرکز بازار ہے۔ کام چاہے آدھے گھنٹے کا ہو۔ مگر وہ بازار میں تین گھنٹے سے کم صرف نہیں کریں گے۔ ساری خبریں، طرح طرح کی افواہیں، جھوٹی سچی وارداتیں سُن کے آتے ہیں اور پھر طرح طرح سے اُس کی تبلیغ کرتے ہیں۔ سیاست سے بہت دلچسپی ہے۔ اور لیڈروں کے نام خاص طور سے یاد ہیں انہیں۔ ذرا جغرافیائی معلومات میں کمزور پڑتے ہیں۔ اس لئے کبھی کبھی ڈھاکے کو بہار میں۔ ناگپور کو بنگال میں۔ لاہور کو ہندوستان میں۔ اور ملتان کو کانپور کے آس پاس شامل کر لیتے ہیں۔ ای

طرح بمبئی میں ہونے والے کسی حادثے کو ہاتھرس سے منسوب کر دیتے ہیں اور دلی میں
ہونے والے واقعے کو بلوچستان پہنچا دیتے ہیں۔

ایک دن ایک نہایت تاریخی اور دھارمک واقعہ اپنے کسی دوست کو
ان الفاظ میں سُنا رہے تھے۔

" جب تیمور لنگ حضرت ابراہیم کے پاس پہنچا اور درشن نے کہا کہ صاحب
طور کے جلوے پہ ہمیں بھی ساتھ لے چلیئے۔ تو حضرت ابراہیم بولے کہ پہلے ہمیں وہ
کشتی تو بنا لینے دو، جس میں بیٹھ کے ہم طور پہاڑ پہ پہنچیں گے۔ وغیرہ وغیرہ "
قصہ تو اس کے آگے بھی بہت کچھ تھا۔ لیکن اس کے آگے کے احوال سُننے کی میری
ہمت نہ پڑی۔

بات چیت کے دوران میں سکندر کو محاورے بولنے کا بڑا شوق ہے۔ مثلاً
"مجبوری کا نام شکریہ" "کاش خدا نخواستہ" "یہ دُنیا آنی کانی ہے" (آنی
جانی ہے)، "بدا چھا گُمنام بُرا" اُن کا سب سے دلچسپ قول تو یہ ہوتا ہے کہ "قبر
کا حال یا تو مُردہ جانے یا زندہ، ہم کیا جانیں"

سکندر کو حادثوں سے بھی بڑی دلچسپی ہے۔ لیکن چھوٹے موٹے حادثے جس میں
کسی کو جان یا مال کا نقصان نہ پہنچے انہیں بالکل نہیں بھاتے ہیں۔ حادثے کو بڑے
فخر سے "ایسی ڈینٹ" (ایکسی ڈنٹ) کہتے ہیں۔ اور صرف اسی حادثے میں جو ایسی ڈینٹ
بن جاتا ہے سکندر کی دلچسپی حد سے بڑھ جاتی ہے۔

ایک بار بازار سے لوٹے تو بڑے پریشان۔ مارے بدحواسی کے سانس
نہیں سما رہا تھا۔ اپنی سائیکل کو بڑی بیزاری سے انہوں نے ایک طرف دیوار

کے ساتھ جھٹکا دے کے کھڑا کر دیا۔ اور ایک کیاری کی مُنڈیر پہ بیٹھ کے کراہنے لگے۔ دھیرے دھیرے گھر والے اُن کے چاروں طرف اکٹھا ہونے لگے اور حال پوچھنے لگے۔ سکندر اس تمام عرصہ میں اپنے سیدھے پاؤں کی دو انگلیوں کو بڑے پیار سے سہلا رہے تھے اور مُنہ ہی مُنہ میں کچھ بُدبُداتے بھی جا رہے تھے۔ ایک ملازم نے آگے بڑھ کے پوچھ ہی لیا۔

"آخر ہوا کیا۔ کچھ بتاؤ بھی تو؟"

سکندر نے غصیلی نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا اور بولے۔

"پرے ہٹ کے کھڑا ہو۔ مُنہ پہ میرے کیوں چڑھا آوے ہے۔ تجھے کچھ نظر نہ آوے ہے۔ جو ہم سے پوچھ رہا ہے کہ کیا ہوا ... دیکھتا نہیں ہے اُنگلیاں ٹیڑھی ہو گئی ہیں"

اُنگلیوں کے ٹیڑھی ہونے کی خبر پہ سب لوگ چونک گئے۔ آخر گھر کی مالکن نے آگے بڑھ کے اور ذرا ڈانٹ کے پوچھا۔

"کیا اُنگلی اُنگلی کئے جا رہے ہو — ؟ اگر چوٹ زیادہ لگی ہے تو ہسپتال جاؤ — مرہم پٹی کرواؤ۔ یہاں بیٹھے بیٹھے کیا کر رہے ہو۔ سیدھی طرح بتاتے کیوں نہیں ہو کہ آخر ہوا کیا — ؟"

سکندر نے آنکھیں اوپر اُٹھائیں، مجمع کو بھانپا، ہلکے سے کراہ کے بولے۔

"ہوتا کیا بیگم صاحب .... ہم سودا سلف خرید کے بازار سے لَوٹ رہے تھے کہ پھل والے نے آواز دی کہ میاں سکندر! کہاں بھاگے جا رہے ہو دو گھڑی کو سُستا لو۔ بس صاحب! ہم نے کہا۔ ایسا بھی کیا ہے۔ ذرا

اُس کی بھی دو باتیں سُنتے چلیں ۔ ہم نے سائیکل کو دوکان کے تختے سے لگا کے کھڑا کیا اور خود دوکان کے سامنے کھڑے ہو گئے ۔ ابھی دو ہی مِلٹ (منٹ) ہوئے تھے ہمیں کھڑے ہوئے کہ دیکھتے ہی دیکھتے ایک گنوار .... زاہل (جاہل) رکشے والے نے اپنا رکشا ہماری طرف بڑھا دیا اور بس اُس کمبخت رکشے کے اگلے پہیے نے آگے بڑھ کے ہمارے پاؤں میں "ایسی ٹینیٹ" کر دیا .... "

" ارے رے رے " کسی نے کہا " اور سکندر تم نے رکشے والے کو یوں ہی چھوڑ دیا ؟ "

سکندر معاف کرنے کے انداز میں بولے ۔

" ارے بھئی ! ہم نے تو آگے بڑھ کے اُس کو گلے سے پکڑ لیا تھا اور اس کو لے جا رہے تھے تھانے کہ اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ اپنے برنادیوی کے تھانے کے دیوان جی چلے آ رہے ہیں ۔ ہمیں جو دیکھا دیوان جی نے تو فوراً آگے بڑھے ۔ اور انہوں نے روگاد (روداد) پوچھی ۔ ہم نے آگے بڑھ کے رکشے والے کا ہاتھ دیوان جی کے ہات میں تھما دیا ۔ اور کہا ۔ آپ خود انصاف کیجئے ۔ اس نے اتنے زور سے ہمارے پاؤں پہ ایسی ٹینیٹ کیا ہے ۔ اس کو کیا سزا ملنی چاہیئے ؟ دیوان جی نے ہمارے پاؤں کو دیکھا اور پھر رکشے والے کو دیکھا ۔ اور بولے ۔ ارے بھئی جانے بھی دو ۔ یہ بے وقوف آدمی ہے ۔ آپ عقلمند آدمی ہیں منشی جی ۔ بات بڑھانے سے کیا فائدہ ۔ معاف کر دو "

پھر مُسکرا کے بولے ۔

" دیوان جی کی بات کیسے ٹالتے صاحب ؟ ۔ پھر انہوں نے تو خود ہی

کہہ دیا کہ آپ ٹھہرے منشی جی ۔ رکشے والا ٹھہرا زاہل (جاہل) آدمی ۔ بس ہم سیدھے سیدھے سائیکل اُٹھا کے چلے آئے ۔

سکندر کی اس سائیکل کا بھی عجیب حال ہے ۔ پچھلے پندرہ سولہ برس ہوئے سکندر کو یہ سائیکل دی گئی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ اس بچاری کے اُس وقت سب کل پُرزے ٹھیک ٹھاک تھے ۔ اب تو اس کی عجیب و غریب حالت ہو گئی ہے ۔ سائیکل کے علاوہ ہر دوسری مشین کا اُس پہ گمان ہوتا ہے ۔ اس کے سارے انجر پنجر گِھس گِھسا کے ایک دوسرے میں اس طرح پیوست ہو گئے ہیں کہ اگر کوئی سائیکل کا موجد بھی چاہے تو اُس کے الگ الگ پُرزے نہیں پہچان سکتا ۔ ہر پُرزے پہ کسی دوسرے پرزے کا گمان ہوتا ہے ۔

سکندر کے اپنے ہاتھ پاؤں کا بھی یہی حال ہے ۔ پاؤں کی وہ اُنگلیاں جن پہ اُس بدنصیب رکشے نے ایسی ٹمینٹ کیا تھا ، سدا سے ایسی ہی ٹیڑھی میڑھی ہیں ۔ چلتے وقت دونوں ٹانگیں اس ترازو کی طرح اونچی نیچی ہوتی رہتی ہیں جس میں اناڑی یا بے ایمان دوکاندار کبھی توازن برقرار نہ رکھ سکتا ہو ۔ ایک قدم آگے بڑھتا ہے تو دوسرا جانے کس طرح پیچھے جانے لگتا ہے ۔ سکندر کو چلتے دیکھ کے بہ یک وقت دُنیا کے آگے بڑھنے اور پیچھے ہٹنے کا ، ترقی کرنے اور خوف کھانے کا خیال آتا ہے ۔ سکندر کے پاؤں ایک پوری اُس نسل کی نمائندگی کرتے ہیں جو آگے بڑھنا بھی چاہتی ہے اور پیچھے سے ہٹنا بھی نہیں چاہتی ہے ۔

سکندر کی چال میں ایک عجیب سا تذبذب پایا جاتا ہے ۔ جیسے وہ چلنے سے پہلے فیصلہ کرنا چاہتے ہوں ۔ مگر کر نہ سکے ہوں کہ کدھر جانا ہے ۔ شاید یہی

تذبذب سکندر کو پیدا کرنے والے کو بھی پیش آیا ہوگا کہ ان کو بھیجے کہ نہ بھیجے - !!

سکندر نے اپنی سائیکل کو بھی اپنی عادتوں اور اپنے ہاتھ پاؤں کے مطابق ڈھال لیا ہے - اس سائیکل کو سکندر کے سوا کوئی دوسرا آدمی نہیں چلا سکتا ہے - سکندر اس سائیکل پہ اتنا ہی حق جماتے ہیں جتنا بعض والدین اپنی اولاد پہ یا بعض شوہر اپنی بیویوں پہ جماتے ہیں - یعنی سکندر جو سلوک چاہیں سائیکل سے کریں - سائیکل کو کوئی حق نہیں ہے کہ وہ ان کے حکم کے خلاف عمل کرے - گھر کے وہ لوگ جو سکندر اور ان کی سائیکل سے واقف ہیں - وہ تو اس سائیکل سے ایسا خوف کھاتے ہیں جیسے بھڑوں کے چھتّے سے یا بجلی کے کھُلے ہوئے تار سے - لیکن ایک بار ایک نئے ملازم نے سکندر کو سوتا دیکھ کے اُن کی سائیکل کو اغوا کرنا چاہا تھا - نتیجے میں اُس بچارے کو کئی دن تک مرہم پٹّی کرانا پڑی تھی -

ایک زمانے میں علی گڈھ میں سائیکلوں کی بہت چوریاں سُننے میں آرہی تھیں - ہر روز کسی نہ کسی کی سائیکل کہیں نہ کہیں سے اور کسی نہ کسی طرح چوری ہو جاتی تھی - سکندر اُس زمانے میں اپنی سائیکل کی طرف سے بہت فکرمند رہنے لگے تھے اور اُن کی کچھ اس طرح کی حالت تھی جیسی اُس غریب باپ کی ہوتی ہے جس کے گھر میں جوان کُنواری بیٹی بیٹھی ہو - اور پڑوس میں اچانک غنڈے آبسیں - ہر روز سکندر سائیکلوں کی چوریوں کی خبریں لاتے تھے اور بدحواس سے رہتے تھے - ایک دن جو سکندر پوسٹ آفس گئے خط ڈالنے تو اُن کو وہاں دیوان جی (پولیس کانسٹیبل) مل گئے - پولیس والوں کو دیکھ کے تو

سکندر کا چلّو دس خون بڑھتا ہے ۔ پھر دیوان جی بھی آخر سکندر کی کمزوری سے واقف تھے ۔ اُنہوں نے محلّہ اوپر کوٹ کے ایک ریٹائرڈ کانسٹیبل کا ذکر چھیڑ دیا جن کی دو بیٹیاں شادی کے قابل تھیں ۔

دیوان جی بھی جلدی میں تھے ۔ اور کسی طرح پوسٹ آفس میں سکندر کی بکواس میں وقت ضائع نہ کرنا چاہتے تھے ۔ لیکن مشکل یہ آپڑی تھی کہ ان دنوں دیوان جی کی اوپر کی آمدنی کچھ یوں ہی سی ہو رہی تھی ۔ اور تیوہار نزدیک آرہا تھا ۔ اس لئے سکندر سے اُن کی شادی کا تذکرہ کرنا ضروری تھا ۔

سکندر حسبِ معمول کھِل اُٹھے ۔ اور بولے ۔

" اب کہیئے دیوان جی ! آپ کو ہم کیا پھرماتیں ؟ "

دیوان جی بولے ۔

" بھیّا ! تم تو جانتے ہو ۔ ہم تو تمہارا گھر بسانا چاہتے ہیں ۔ اسی نیت سے لڑکی والوں پہ نظر رکھتے ہیں ۔ کچھ روپیہ پیسہ بھی اُن پہ خرچ کرتے ہیں کہ تمہارا کام نکل جائے ..... اب یہی اوپر کوٹ والوں کو دیکھو ۔ گھر والے سب ٹھیک ٹھاک کر لئے تھے ۔ لیکن لڑکی کا بھائی اڑ گیا ہے کہ ہم تو لڑکے کو دیکھیں گے اور پھر کچھ کہیں گے "

" لڑکے " کے نام پہ سکندر کچھ مسکرائے ، کچھ شرمائے ۔ پھر بولے ۔

" آں ہاں ..... تو اس میں کیا مُجائکہ ہے ..... لڑکے میں کیا کھرابی ہے ..... مریج ہے لڑکا کہ بیمار ہے لڑکا ؟ ۔ تم نے کہا نہیں اُن سے دیوان جی کہ لڑکا ہجاروں میں ایک ہے ..... کوئی عیب اس میں

نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور کسی عیب میں وہ نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سارے کالج میں ہم سر نام ہیں (مشہور ہیں) ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جس سے چاہیں پوچھ لیں ہماری بابت ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

دیوان جی نے کہا۔

"یہ باتیں تو میں نے سب اُن کو بتا دیں ۔ مگر تم جانو لڑکی کا معاملہ ہے چھان بین تو کرتے ہی ہیں گھر والے"

"ارے صاحب — ! جتنی چھان بین چاہیں کر لیں — ہمیں کیا ڈر ہے — !"

دیوان جی نے کہا "وہ جات برادری کا معاملہ ہے نا"

"جات برادری کا کیسا معاملہ ؟"

"بھئی وہ لوگ پٹھان ہیں ۔ اور پٹھان ہی کو لڑکی دیں گے — اور تم ٹھہرے شیخ"

"آں ہاں ۔ ۔ ۔ ۔ ہم تو ٹھہرے شیخ — پر اس سے کیا ہووے ہے ۔ ہم اُن کی خاطر بن جائیں گے پٹھان ۔ ۔ ۔ ۔" سکندر نے بڑی فراخ دلی سے کہا۔

"کیوں باؤلے ہوئے ہو — بھلا بننے سے کوئی بنتا ہے ۔ ذات برادری آدمی بانٹ نہیں سکتا ۔ نہ خرید سکتا ہے — وہ تو پیدائش کے ساتھ ساتھ چلتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔"

سکندر نے مُنہ بنا کے کہا۔

"ارے تو چلے ساتھ ساتھ جات برادری بھی — ہمیں کیا ڈر ہے ۔ کیا

شیخوں کو لڑکیاں نہ ملتی ہیں . . . . " پھر ذرا نرم پڑے اور بولے " لیکن دیوان جی ۔! ہم تو جانتے ہیں ۔ آپ چاہو گے تو جرور ہی ہمارا کام بنجائیگا کسی کی جات برادری بدلنا تو تمہارے بائیں ہات کا کھیل ہے . . . یاد ہے وہ مسیتا کی شادی تم نے کرائی تھی سیدوں میں ۔ اور ساری دُنیا جانے ہے کہ میستا اصل نسل کا کھالص جولاہے کی جات سے ہے "

دیوان جی مسکرائے ۔ کچھ خوش بھی ہوئے پھر بولے ۔

" بھئی ہم کیا ہیں ۔ سب اوپر والے کی قدرت ہے ۔ اب تمہارا ہی معاملہ ہے ۔ ہم تو اپنی سی سب کر رہے ہیں ۔ پر تم جانو ۔ زمانہ ہی خراب ہے ۔ پھر اپنی حالت بھی آج کل ذرا یوں ہی سی ہے ۔ ویسے ہم روپے پیسے کا کچھ خیال نہیں کر رہے ہیں اس سلسلے میں ۔! " دیوان جی اب معاملہ پہ آپہنچے تھے ۔

سکندر خوش ہو کے بولے .

" روپے پیسے کا آپ خیال نہ کریں دیوان جی ۔! جب تلک سکندر کے دَم میں دَم ہے وہ پیچھے ہٹنے والوں میں سے نہیں ہے ۔ روپے پیسے کی آپ پھکر نہ کریں جو آپ کہیں میں آپ کو بھر جاؤں ۔! "

دیوان جی نے کہا " آج رات کو لڑکی کے بھائی کو ذرا سینما دِکھانے لے جاؤں گا ۔ وہاں چائے پانی سے اس کی خاطر کروں گا ۔ دیکھو شاید جم جائے تمہارا معاملہ "

سکندر نے بڑی شان سے جیب میں ہات ڈال کے دس روپے دیوان جی کی نذر کئے ۔ دیوان جی بولے ۔

"ارے بھئی! اتنے میں تو آج کل سادا پانی بھی کوئی نہ پلا دے ہے کسی کو۔ اور تم چلے ہو اپنے سالے کو اس رقم سے ٹالنے ۔۔۔"

"سالے کو — یعنی بیوی کے بھائی کو۔"

ہائے ہائے سکندر اس رشتے کا نام سن کر شرما شرما کے مسکرانے رہے اور بولے ۔

"ہاں صاحب —! سالے کی بات ہی اور ہوتی ہے ۔۔۔ لوگ باگ کہے ہیں ۔ ساری خدائی ایک طرف ۔ بیوی کا بھائی ایک طرف ۔"

اور پانچ روپے سکندر نے بیوی کے بھائی کی مزید خاطر کے لئے دیوان جی کو دیئے ۔ پھر احتیاطاً پوچھ بیٹھے ۔

"کوئی اور بہن بھی ہیں اُن کی ؟"

دیوان جی ذرا چکرائے ۔ پھر سنبھل کے بولے ۔

"ہاں ۔ ہاں — کیوں نہیں ۔ کیوں نہیں — بھرے گھر کی لڑکی ہے بھئی وہ۔ دو بہنیں اس کی اور ہیں ۔"

"دو اور ہیں ؟" سکندر خوشی اور اطمینان سے بولے ۔

"آں ہاں بھئی ! دو اور ہیں ۔" دیوان جی نے جواب دیا۔

سکندر مسکراتے ہوئے بولے ۔

"بس دیوان جی ! ہمارا دل کہے ہے کہ سکندر نمبرا کا کام تو یہیں بنے گا ۔۔۔ ارے صاحب ! ایک سے نہ ہوگی شادی تو دوسری تو ہے ۔ اور وہ بھی کسی وجہ سے رہ گئی تو پھر تیسری کہاں جائے گی بچ کے ۔۔۔ ؟"

دیوان جی اب جلد سے جلد بھاگنا چاہ رہے تھے، بولے۔

"جی ہاں! نیسری کہاں جائے گی۔ ہم نے تو سکندر اسی خیال سے اس بار ایسا گھر دیکھا ہے جہاں تین تین لونڈیاں موجود ہیں۔ اب بھی کوئی ایک تو تیرے مقدر میں ہو گی ہی۔"

دیوان جی چلے گئے۔ سکندر تھوڑی دیر تک لوہے کا جنگلہ پکڑے کھڑے رہے وہ تینوں لڑکیوں کے خیال میں گم تھے

جب وہ اپنے خیالوں کی دُنیا سے نکل کے اپنی پُرانی، باسی اور گنواری دُنیا میں آئے تو انہیں گھر جانے کا خیال آیا۔ اور پھر اپنی سائیکل کا خیال آیا۔۔۔۔ باہر نکلے تو سائیکل غائب۔

سکندر کے ہوش گم ہو گئے۔ چیخ و پکار شروع کی انہوں نے۔ اور پوچھ تاچھ کی۔ سائیکل کا ناک نقشہ، حسب نسب سب کچھ بتاتے پھر رہے تھے۔ لیکن سائیکل نہ ملنا تھی نہ ملی۔ لوگ باگ اِدھر اُدھر اکٹھے ہو گئے اور طرح طرح کی سائیکلوں کی چوریوں کا ذکر کرنے لگے۔ آخر کار تھک ہار کے اور سائیکل کو صبر کر کے سکندر پیدل ہی گھر لوٹے۔

گھر میں وہ اس طرح تھکے ہارے داخل ہوئے جیسے کوسوں کا سفر کر کے آ رہے ہوں۔ حالانکہ پوسٹ آفس دو فرلانگ کے فاصلے پر تھا۔ لیکن سکندر تو گھر کی چہار دیواری کے علاوہ کہیں بھی پیدل نہیں چلتے تھے۔ ہر دم اپنی اُسی سائیکل پہ سوار رہتے تھے۔ سکندر ابھی چوری کی داستان ختم بھی نہ کر سکے تھے کہ دروازے پہ کسی نے زور زور سے دستک دی۔

سکندر کچھ جھومتے جھامتے اُٹھے۔ اور بیزاری سے دروازے کی طرف بڑھے اور پلک جھپکتے جو لوٹے ہیں تو خوشی سے بے حال، اپنے سارے ٹیڑھے میڑھے دانت نکالے اپنی سائیکل جھاڑتے پونچھتے اندر داخل ہوئے۔ قصّے میں جان آ گئی تھی۔ گھر والے سب سکندر کے آس پاس جمع ہو گئے۔ تو سکندر بہت فخر سے بولے۔

" دیکھیئے! ہم نہ کہتے تھے، ہماری چیز کہاں جا سکتی ہے۔ اب پوچھیں گے ذرا سائیکل چور سے کہ بچّا! سکندر کی سائیکل چرانا مجاک نہیں ہے۔"

کسی نے پوچھا " چور پکڑا گیا؟"

" آں ہاں — پکڑا گیا" سکندر نے کہا۔

" تو کیا تھانے میں ہے چور؟ " کسی نے پوچھا۔

سکندر مسکرا کے بولے۔

" تھانے کیوں نہیں جائے گا۔ اگر جندہ رہا تو ضرور ہی تھانے جائے گا۔ ابھی تو ہسپتال میں پڑا ہے۔ سائیکل سے گر کر ہڈّی پسلی ایک ہو گئی ہے ... بے ہوش پڑا ہے"۔

سکندر کے گھر سیاپ آئے

سکندر کو گھومنے پھرنے کا بہت شوق ہے۔ دہلی میں انہوں نے ایک سردار سے دوستی کرلی تھی۔ اسی کے ساتھ باہر آتے جاتے تھے۔ ایک دن بہت شام گئے تک بھی نہ لوٹے تو مجھے فکر شروع ہوئی۔ آخر میں آٹھ بجے رات کو سکندر اکیلے گھر لوٹے۔ میں نے انہیں ڈانٹا کہ اتنی دیر تک کہاں غائب رہے سارے کاج چھوڑ کے ؟۔

بولے "ارے صاحب! کیا بتائیں۔ آج کیا قصہ ہو گیا"

میں نے پوچھا "کیا قصہ ہو گیا؟"

کہنے لگے "دیکھئے تو۔ ہوا یہ کہ ہم دونوں یعنی سردار اور میں چلے بازار کو۔ پہلے پہنچے فتحپوری۔ وہاں میں نے خریدا کوئلہ اور جوموڑ کے دیکھا تو کیا دیکھا کہ نہ سردار نہ میں۔ وہاں سے گھبرایا گھبرایا میں آیا چاندنی چوک۔ اِدھر دیکھا اُدھر دیکھا لیکن دیکھا

کہ سردار نہ ہیں ..... وہاں سے بھاگا بھاگا آیا کشمیری گیٹ۔ پھر دیکھا کہ نہ سردار نہ میں ۔ اسی چکر میں گھر پہنچا تو دیکھا کہ نہ سردار نہ میں ۔"

سکندر یہ کہتے جاتے تھے اور ہاتھوں کو نچاتے جاتے تھے۔ اب اُن سے کوئی کیا پوچھتا کہ بھئی سردار تو نہیں تھا لیکن یہ آخر " میں " کہاں چلا گیا تھا ....؟ لیکن سکندر کی زبان پہ تو محاورہ چڑھا تھا کہ نہ آدم نہ آدم زاد ۔ انہیں کون کچھ سمجھ سکتا تھا ۔

فسادات کے زمانے میں سکندر دہلی میں تھے ۔ لیکن تفصیل سے کچھ نہ جانتے تھے۔ انہیں تو بس یہ معلوم تھا کہ لڑائی جھگڑا ہو رہا ہے ۔ کون کس سے جھگڑ رہا ہے، اور کیوں جھگڑ رہا ہے ۔ اور جھگڑے میں کس کا پلّہ بھاری ہے، ان سب باتوں کا نہ تو سکندر کو دھیان آیا تھا، نہ وہ ایسی باتوں پہ دھیان دینے کے قائل تھے ۔ انہیں تو صرف یہ بات کھلتی تھی کہ وہ آزادی سے گھوم پھر نہیں سکتے ۔ اور گھر پہ پڑا رہنا، سکندر کے لئے تقریباً سولی پہ لٹکنے کے برابر ہے ۔ ایک دن اپنے دوست سردار سے بولے ۔

" بھئی گھر میں بیٹھے بیٹھے گھبرا گئے ہم تو ۔ کہیں باہر چلو، گھوم پھر آئیں "

سردار نے ان کی طرف حیرت سے دیکھا پھر کہا ۔

" آج نہیں ! کل چلیں گے گھومنے گھامنے ..."

" کل ہی سہی "

سکندر نے کہا اور بیٹھ رہے ۔ دوسرے دن پھر سکندر نے سردار کو یاد دلایا کہ ۔

" بھئی کل تو تم نے ہم کو ٹال دیا تھا ۔ لیکن آج تو باہر ضرور

ہی چلو باہر۔"

سردار نے تفریح کو مزید ٹالنا چاہا، بولا۔

"بھئی سکندر میاں! بات یہ ہے کہ... بھئی ایسی جلدی کیا ہے۔ ذرا اطمینان ہونے دو، پھر چلیں گے گھومنے پھرنے۔"

سکندر بولے۔

"ایسی کیا بے اطمینانی ہے۔ تجھ کو.... نہ بھائی.... ہم تو آج جروری ہی باہر جائیں گے۔"

سردار نے اس احمق کو سمجھانا چاہا۔

"ارے بھائی سکندر میاں! تم سمجھتے نہیں ہو۔ ابھی شہر کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ گھر سے ابھی کچھ دن تک نہیں نکلنا چاہیے۔"

"کیوں نہیں نکلنا چاہیئے؟" سکندر نے جھنجھلا کے پوچھا۔

سردار نے سمجھاتے ہوئے جواب دیا۔

"کہہ تو دیا تم سے کہ ابھی شہر کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ تھوڑے دن صبر کرلو۔ پھر چلیں گے۔"

اب سکندر کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ جل کے سردار سے بولے۔

"اچھا۔ اچھا۔ تو یوں کہہ کہ ڈرتا ہے تو ہم سے۔ ارے بھئی! بے فجول میں ڈرتا ہے تو ہم سے..... چل ہمارے ساتھ۔ ہم تجھے اکین دلاتے ہیں ہم سے مت ڈر۔ ہم تجھے کچھ نہیں کہیں گے۔"

اسی زمانے میں ایک دن خریداری کے لئے سکندر کہیں باہر گئے تو نو بجے

رات تک اُن کا کوئی پتہ نہ چلا۔ ہم سب سخت پریشان اور بدحواس تھے۔ اور بے چینی سے سکندر کا انتظار کر رہے تھے۔

تقریباً نو بجے رات کو سکندر ہانپتے، کانپتے۔ غصّے سے لال پیلے، مُنہ ہی مُنہ میں کسی کو کچھ بُرا بھلا کہتے گھر میں داخل ہوئے، جب قریب آئے تو یہ کہتے سُنے گئے کہ "یہ بھی کوئی شرافت ہے۔ نہتّا دیکھ کے حملہ کر بیٹھے۔ ہوتا ہمارے پاس بھی کوئی ڈنڈا تو پوچھتے۔"

سکندر کو بار بار اپنے نہتّے پن کا اور حملہ آور کی غیر شریفانہ حرکت کا تذکرہ کرتے سُنا۔ تو سب لوگ گھبرا گئے۔ فسادات کا زمانہ تھا۔ طرح طرح کے خیالات لوگوں کے دماغ میں آرہے تھے۔ آخر ایک آدمی نے آگے بڑھ کے پوچھا۔

"کس نے حملہ کیا؟ کون تھا وہ؟"

سکندر غصے سے بولے۔

"ہوتا کون — دو ڈبل کُتّے تھے۔"

ایک رات کو سب گھر والے سو رہے تھے کہ سکندر نے اچانک گھر کے مالک کی مسہری کے پاس آکے آواز دی۔

"صاب۔ صاب۔"

مالک نے گھبرا کے پوچھا۔

"کیا ہے سکندر۔ خیریت تو ہے؟"

"خیریت کہاں ہے صاب — وہ سیاپ آئے ہیں۔"

"کون صاحب آئے ہیں۔ کیا کوئی مہمان ہیں؟"

"مہمان نہیں صاب! سیاپ آئے ہیں۔"

"ارے بھئی کون صاحب؟ کیا خان صاحب آئے ہیں؟"

"جی نہیں صاب" سکندر نے جواب دیا۔" خان صاب نہیں، صرف سیاپ آئے ہیں۔"

گھر کے مالک کو اب غصہ آچکا تھا۔ بگڑتے ہوئے بولے۔

"آخر صاف صاف کیوں نہیں بتاتا ہے۔ کون صاحب آئے ہیں؟"

سکندر نے اُسی اطمینان سے جواب دیا۔

"صاف صاف تو بتا رہا ہوں صاب، کہ سیاپ آئے ہیں"

صاحب نے غصّہ سے پوچھا۔

"کیا نام ہے اُن صاحب کا؟"

"نام ۔ نام کیسا؟" سکندر نے حیرت سے پوچھا۔

صاحب اب اُٹھ کے بیٹھ گئے تھے، اور سکندر کی باتوں پر اُن کو سخت غصہ آرہا تھا۔ آخر انہوں نے بستر سے اُٹھتے ہوئے پوچھا۔

"آخر وہ صاحب ہیں کہاں؟"

سکندر آگے بڑھ کے ہولے سے بولے۔

"آدھے بِل میں ہیں۔ آدھے باہر ہیں ۔!"

❖

سکندر اور چور

اچھا بھلا لفظ سکندر کی زبان پر چڑھتا ہے تو کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے، ایک دن میں نے اُن کو باہر جاتے ہوئے دیکھا تو فرمائش کی کہ "کولی نوس ٹوتھ پیسٹ" اور " یوڈی کلون "، خرید تے لائیں ۔۔ سکندر گھر لوٹے تو بہت خفا تھے۔ بولے۔
" جانے کہاں کے بیوقوف دوکاندار آگئے ہیں شمشاد بلڈنگ میں ۔ کوئی بات ہی نہیں سمجھتے ہیں "۔

میں نے پوچھا " آخر کیا ہوا ؟ "

بولے " ہم نے دوکاندار سے کہا کہ ذرا کالی داس دے دو، تو اُس نے ہنسنا شروع کر دیا ۔ ہمیں بڑا غصّہ آیا . . . . اور ہمارا اس سے جھگڑا شروع ہو گیا لوگ باگ جمع ہو گئے "۔

دوکاندار پوچھنے لگا "کالی داس ہم کہاں سے لادیں آپ کو؟"
ہم نے کہا "کیوں بھئی، کیا گورنمنٹ نے مناہی کر دی ہے کالی داس استعمال کرنے کی۔؟"
"استعمال؟ استعمال کیسے کروگے کالی داس کو؟" دوکاندار ہنستے ہوئے بولا "سکندر میاں۔ اپنے یہاں تو تیل، صابون، کنگھا، منجن ملتا ہے۔ اگر تمہیں کالی داس لینا ہے تو راستے میں کالج کی لائبریری پڑتی ہے وہاں جاؤ۔"
سکندر جھنجھلا کے بولے "کالج کی رائے بریلی (لائبریری) میں تو کتابیں رکھی ہیں . . . وہاں کالی داس کہاں ملے گا؟"
پھر الماری کی طرف اشارہ کر کے بولے۔
"ارے کاہے کو وقت خراب کرتا ہے بھئی۔ وہ دیکھو تمہارے پاس ہے تو کالی داس۔ بس یہی چاہیئے۔"
اور سکندر اس طرح کولی نوس ٹوتھ پیسٹ خرید کر لائے۔
یوڈی کلون کے سلسلے میں انہوں نے ایک کیمسٹ کی دوکان کا انتخاب کیا۔ وہاں جاکے بولے "ایک شیشی گولی کونین دے دو۔"
کیمسٹ نے ایک شیشی انہیں تھما دی۔ سکندر بہت خفا ہو کے بولے۔
"یہ کیا ہے۔ یہ تو گولیاں ہیں؟"
دوکاندار نے کہا "یہی تو آپ نے مانگی ہیں۔ کونین کی گولیاں۔"
سکندر دوکاندار کی حماقت پر ہنستے ہوئے بولے۔
"ارے صاحب! یہ تو وہ گولیاں ہیں . . . ملیریا میں کھانے کی۔ اور ہمیں تو

چاہیئے، گولی کونین کی شیشی، جس میں چھڑکنے والا تیل ہوتا ہے "
دوکاندار نے گولیاں واپس لیں اور ایک بوتل سکندر کو تھما دی۔ بوتل دیکھ کر سکندر چراغ پا ہو گئے۔ جل کے بولے۔
" بالکل ہی اُلّو سمجھ لیا ہے۔ یہ کیا تھمائے دے رہے ہیں آپ ؟ "
دوکاندار نے کہا " یہی چھڑکنے والا تیل ہے۔ فنائل میں ڈی۔ ڈی۔ ٹی ملی ہوئی ہے "
سکندر خفا ہو کے بولے۔
" یہ نہیں چاہیئے ہم کو ..... فنائل اور ڈی۔ ڈی۔ ٹی تو ہم سب سمجھتے ہیں ... ہمیں تو گولی کونین چاہیئے۔ جو کپڑوں پر بھی چھڑکتے ہیں "
دوکاندار نے عاجز آ کے انہیں فلٹ کا ڈبہ تھما دیا جسے سکندر نے کاونٹر پر پٹخ دیا اور بولے۔
" واہ صاحب واہ ــــ فلٹ کو ہم نہیں پہچانتے ہیں کیا۔ اس سے تو مکھیاں مرتی ہیں "
آخر کار دوکاندار نے اُن سے کہا کہ تم خود اشارہ کر کے بتاؤ کہ کون سی شیشی تمہیں چاہیئے ــــ سکندر نے یوڈی کلون کی شیشی دیکھی تو چیخ کے بولے ــ
" بس یہی تو ہے گولی کونین کی شیشی ... یہی تو ہمیں چاہیئے "
اور اس طرح بیچارے کیمسٹ کی جان بچی ــ !
پولیس والوں سے سکندر کی دلچسپی حد سے بڑھی ہوئی ہے۔ دُنیا میں

اُن پر کسی شخص کا یا کسی عہدے کا وہ رعب نہیں پڑتا ہے، جو پولیس کی وردی میں ملبوس کسی بھی اُلٹے سیدھے آدمی کو دیکھ کر اُن پر پڑتا ہے۔ اُن کے خیال میں پولیس کانسٹبل ہونا دُنیا کی سب سے بڑی نعمت ہے۔ کانسٹبل کو بڑی عزت اور احترام سے دیوان جی کہتے ہیں اور یہ لفظ اُن کے منہ میں مصری کی ڈلی کی طرح گھُل جاتا ہے۔ ایک بار گھر میں ایک صوبے کے گورنر صاحب، جن سے گھر والوں کے پُرانے مراسم تھے، تشریف لارہے تھے۔ اُن کی آمد کے سلسلے میں ایک دن پہلے گھر کے آس پاس پولیس یا سی، آئی، ڈی کے آدمی ضابطے کی خانہ پُری کے لئے آجارہے تھے۔ سکندر کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ ہی نہ تھا۔ بار بار اس طرح بھاگ بھاگ کے باہر جارہے تھے اور اس طرح پولیس والوں کی خاطر مدارات کررہے تھے، جیسے اپنی بارات کی دیکھ بھال میں مصروف ہوں۔ گھر کا سارا کام کاج انہوں نے چھوڑ رکھا تھا۔ اور تمام تر توجہ دیوان جی پہ صرف کررہے تھے۔

دوسرے دن صبح نو بجے گورنر صاحب تشریف لائے تو سکندر بھی گھر والوں کے آس پاس منڈلاتے دیکھے گئے۔ ان کے ہاتھ میں پانی سے بھرا ہوا ایک گلاس تھا اور وہ انتظار کررہے تھے کہ جلد سے جلد بھیڑ چھٹے تو وہ باہر نکل سکیں۔

گورنر صاحب نے سکندر کو جو دیکھا تو بڑے تپاک سے آگے بڑھے اور بولے۔

"ارے بھئی سکندر! ارے بھئی سکندر! اچھے تو ہو۔ آؤ۔ ذرا ہاتھ تو ملاؤ"

سکندر نے بڑی عجلت میں جواب دیا۔

"جی ہاں، اچھے ہیں ہم" اور ہاتھ ملانے کی پیش کش کو انہوں نے یہ کہہ کر رد کردیا کہ "صاحب۔ ذرا راستہ دیجئے..... ہم باہر جائیں گے۔ باہر دیوان جی

کھڑے ہیں ۔ ہم اُن کے لئے پانی لے جا رہے ہیں "

ایک دفعہ پڑوس میں چوری ہو گئی ۔ سکندر کی خوشی کی کوئی حد نہیں تھی ۔ لوگ باگ چور کی کھوج میں تھے ۔ اور چوری کے متعلق باتیں کر رہے تھے ۔ سکندر کو پولیس والوں کا انتظار تھا ۔ اور دیوان جی کے آتے ہی انہوں نے آگے بڑھ کے اور ہات چلا چلا کے چوری تفصیل بیان کرنا شروع کی ۔

تھانیدار نے مالک مکان سے پوچھا ۔

" آپ نے کوئی نیا نوکر رکھا تھا ؟ "

سکندر آگے بڑھ کے بولے ۔

" ارے دیوان جی ! ہر روز نئے نوکر آتے رہتے ہیں ۔ یہاں کوئی دو دن سے زیادہ ٹکتا ہی نہیں "

مالک مکان نے کہا " اِدھر ایک مہینے سے تو ایک ہی ملازم یہاں کام کر رہا ہے "

تھانیدار نے پوچھا " چوری کس کمرے میں ہوئی ؟ "

مالک نے کہا " ہم لوگ برآمدے میں سو رہے تھے ۔ سامان بیڈ روم میں تھا ۔ اس کمرے میں چوری ہوئی "

سکندر نے کہا " اس کے مطلب یہ ہوئے کہ چور برآمدے سے نہیں بلکہ پیچھے کی کھڑکی سے کود کر کمرے میں داخل ہوا . . . "

تھانیدار نے پوچھا " آپ لوگوں کو کوئی کھٹکا وغیرہ تو نہیں سنائی دیا تھا ؟ "

سکندر بولے " کھٹکا تو ضرور ہی ہوا ہوگا ۔ یوں کہیئے کہ یہ لوگ بے خبر سو رہے تھے "

تھانیدار نے کہا " آپ کا کُتا گھر کے اندر تھا، کہ باہر ؟ "

سکندر نے جواب دیا " کتوں کو تو ایسے موقعوں پر چور لوگ نشہ کھلا دیتے ہیں "

تھانیدار نے پوچھا " گھر کی بتّی جل رہی تھی کہ نہیں ؟ "

سکندر نے کہا " دو ڈھائی بجے رات تک تو جل رہی تھی ۔ اس کے بعد ہم سو گئے تھے ۔ پتہ نہیں کب تک جلی . . . . ویسے چور ایسے موقع پر پتھر مار کے بلب بھی توڑ دیا کرتے ہیں "

سب نے ایک ساتھ باہر کی بتّی پر نظر ڈالی تو اتفاق سے بلب ٹوٹا ہوا ملا ۔ سکندر نے بڑے فخر سے سب کی طرف دیکھا ۔ وہ اپنی اس تفتیش پر بہت خوش نظر آرہے تھے ۔

اسی طرح انہوں نے چوری کے سلسلے میں کچھ ایسی باتیں کہہ ڈالیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نہ صرف یہ کہ سکندر کو چوری کے بارے میں کچھ معلومات ہیں بلکہ شاید وہ خود اس چوری میں شامل بھی رہے ہیں ۔ آنکھوں دیکھا حال بیان کرنے کی اُن کو عادت ہے ۔ پھر اس دن اتفاق سے دیوان جی بھی کوئی نئے تھے ۔ انہوں نے سکندر کو جو اس طرح بڑھ بڑھ کے بولتے سُنا تو اُنہیں سکندر ہی پر کچھ شبہ ہونے لگا اور انہوں نے کہا ۔

" تم میرے ساتھ تھانے چلو ۔ وہاں تمہارا بیان قلمبند ہوگا "

سکندر نے اپنی اس اہمیت پر اور بھی فخر کا اظہار کیا۔ اِدھر اُدھر مجمع پر نظر ڈالی اور بڑے اعتماد سے بولے ۔

" تھانے لے جاکے کیا کیجئے گا ؟ قلم تو آپ کے پاس ہے ہی۔ اس میں ہمارا بیان بند کر لیجئے "

دیوان جی ذرا کڑوے مزاج کے تھے۔ وہ سکندر کے اس والہانہ عشق سے قطعی ناواقف تھے جو اُن کو محکمۂ پولیس کے افراد سے تھا۔ بگڑ کر بولے ۔

" بک بک مت کرو۔ سیدھے تھانے چلو . . . . وہاں تیرا مزاج درست کریں گے ۔!"

اب سکندر معاملے کی سنگینی تک پہنچ گئے تھے۔ خود بھی بگڑ کے بولے۔

" معلوم ہوتا ہے نئے نئے آئے ہو دیوان جی ! ۔ اِس علاقہ میں . . . "

دیوان جی نے ذرا سختی سے کہا " ہم نئے نئے آئے ہیں کہ نہیں، اس سے تمہیں کیا مطلب . . . "

سکندر جھنجھلا کے بولے " آخر آپ کو ہم پہ کیا شبہ ہے ؟ ہم چور لگے ہیں آپ کو ؟ " پھر بہت اکڑ کے بولے " اچھا صاحب ! ہم چور ہیں ۔ ہم نے کی ہے چوری ۔ اگر اصل نسل دیوان جی ہیں، آپ تو نکالئے چوری کا مال ہمارے پاس سے "

جس گھر میں چوری ہوئی تھی اس گھر والے اِس جھگڑے پر سخت کڑھ رہے تھے ۔ ان کا معاملہ جہاں کا تہاں تھا۔ اور اِدھر سکندر میاں نے ایک دوسرا جھگڑا اُٹھا دیا تھا۔ بات خاصی بڑھنے لگی تھی کہ اچانک پولیس کپتان کی گاڑی آتی

نظر آئی ۔ دیوان جی نے آگے بڑھ کے سلوٹ کیا اور گاڑی کا پٹ کھولا۔ کپتان صاحب سکندر کو اچھی طرح پہچانتے تھے ۔ سکندر اُن کو دیکھتے ہی آگے بڑھے ۔ اور بولے ۔

" صاحب ! یہ کہاں سے دیوان جی پکڑ وا لئے ہیں آپ نے ؟ ۔ انہیں شریف آدمی بھی چور نظر آدے ہیں "۔

دیوان جی نے جلدی جلدی مختصر فقروں میں سکندر کے بارے میں بتایا تو کپتان صاحب کو بے اختیار ہنسی آگئی ۔ وہ سکندر کی پوری ہسٹری سے واقف تھے انہوں نے سکندر سے کہا ۔

" میاں گھر جاؤ ۔ ہمارے لئے چائے بناؤ ۔ وہیں آکے بات کریں گے "۔
اور دیوان جی سے کہنے لگے ۔

" دیوان جی ! اس علاقے میں آئے ہوئے آپ کو چار پانچ مہینے ہو گئے ۔ اور ابتک سکندر سے ناواقف ہیں آپ ۔ اس طرح کیسے کام چلے گا "؟

سکندر فاتحانہ انداز سے جھومتے جھامتے گھر آگئے اور بات آئی گئی ہو گئی۔ لیکن اس واقعے سے اتنا فرق ضرور پڑا کہ آئندہ سے سکندر اتنے محتاط رہنے لگے ہیں کہ دیوان جی کی وردی سے بات چیت شروع کرنے سے پہلے اُن کا چہرہ مہرہ بھی اچھی طرح دیکھ لیتے ہیں ۔

پچھلے سال علی گڑھ میں فرقہ وارانہ فسادات کی واردات ہوئی ۔ تو ہر شریف اور بھلا مانس انسان اُن ناخوشگوار واقعات سے اُداس اور ہراساں تھا ۔ کرفیو لگا تو پریشانی اور بڑھی ۔ سارے کام کاج بند ہو گئے ۔ عجیب سی بددلی اور مایوسی فضا پر طاری تھی ۔ سکندر نے اس طرح کی خبریں سنیں تو ذرا دیر

کچھ سوچتے رہے ۔ لیکن جیسے ہی انہیں پتہ چلا کہ شہر اور یونیورسٹی پر پولیس کا پہرہ ہے ۔ تو ان کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی ۔ بے حد خوش ہو ہو کے ہر منٹ ایک نئی خبر اس فخر سے سُنانے آتے جیسے کسی میلے کی چہل پہل کا ذکر کر رہے ہوں ۔ بار بار اپنی تاریخی سائیکل اُٹھاتے تھے اور پیچھے کے دروازے سے گھر والوں کی نظریں بچا کے نکل جاتے تھے ۔

کرفیو کی وجہ سے دو دن ڈاک نہ آئی ۔ گھر والوں کو ڈاک کا منتظر دیکھ کر سکندر اچانک گھر سے غائب ہو گئے ۔ اور سیدھے سیدھے پوسٹ آفس کی طرف سائیکل دوڑانے لگے ۔ راستے میں دو دفعہ کانسٹبل نے سیٹی دی ، جسے سکندر نے بہرے ہونے کے کارن سُنا نہیں اور آگے بڑھتے گئے ۔ نکڑ والے کانسٹبل نے انہیں ہاتھ دکھا کے روکنا چاہا تو بولے ۔

" ہم جلدی میں ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ڈاک پہنچانی ہے گھر ۔ ۔ ۔ دیکھتے نہیں ہو دیوان جی !

" ہم کون ہیں ؟ " پھر اپنی ۔ ۔ ۔ ۔ ٹوپی کی طرف اشارہ کر کے بولے " یہ نہیں دیکھتے ہو کیا ہے ؟ "

دیوان جی نے حیرت اور بیزاری سے کہا " یہ کیا ہے ۔ ٹوپی ہے "

بولے " یہ تمہیں صرف ٹوپی لگتی ہے ۔ ارے بھیّا ہم نے تو سُنا ہے ، جو یہ ٹوپی پہن لیتا ہے وہ حکومت کا آدمی ہو جاتا ہے "

دیوان جی کو سکندر کی سادہ لوحی پر ہنسی آگئی ۔ اور انہوں نے کہا " سیدھے سیدھے گھر چلے جاؤ "

لیکن سکندر سیدھے سیدھے پوسٹ آفس پہنچے اور اُس بچارے ڈاکیہ سے

جو اُن دنوں ہمارے محلّے کی ڈاک لاتا تھا بولے۔

"کیوں جی! ڈیوٹی بھی کوئی چیز ہے۔ تین دن سے ڈاک کا انتظار ہو رہا ہے، اور تم یوں آرام کر رہے ہو۔ شرم نہ آوے ہے تمہیں؟"

ڈاکیئے نے کہا "بھیا سکندر! ہم تو بال بچّے دار آدمی ہیں۔ جان پیاری ہے ہمیں تو...... مر گئے تو بیوی بچّوں کو کون پوچھے گا؟"

سکندر کو بچوں سے تو قلبی نفرت ہے۔ اس لیے بچّوں کے مسئلے کو گول کر گئے۔ لیکن جب گھر آ کے یہ واقعہ سنا رہے تھے تو اُن کے تیور سے اندازہ ہوتا تھا کہ غالباً ڈاکیہ کی بیوی کے مستقبل کی طرف سے کافی مطمئن ہیں۔

ڈاکیئے سے یہ باتیں کیں اور جتنی ڈاک اُن کے ہات لگی سب سمیٹ کے اپنے تھیلے میں رکھی۔ گھر آئے اور برآمدے کے فرش پر ساری ڈاک پھیلا دی۔ گھر والوں کو ڈاک دے کے پورے محلّے کی ڈاک بانٹ آئے۔

یوں تو سکندر اپنی کڑوی زبان کی وجہ سے اکثر دوکانداروں وغیرہ کو ناراض کرتے رہتے ہیں۔ لیکن عبدالشکور نامی ایک پھل والے سے اُن کی نوک جھونک آئے دن ہوتی رہتی ہے۔ اور سکندر کا گزر جب بھی اُس کی دوکان کی طرف سے ہوتا ہے تو اس مخاطب ہو کے یہ ضرور کہہ آتے ہیں کہ تو ٹھہرا ایک نمبر کا بے ایمان! ہم تجھ سے بے حد کر کے نفرت کرتے ہیں۔

کرفیو ختم ہوا۔ اور حالات نارمل ہونے لگے تو سکندر مزید معلومات کی خاطر بازار پہنچے۔ وہاں انہیں بہت سارے جان پہچان والوں کی کمی نظر آئی۔ آگے بڑھے تو دیکھا عبدالشکور اپنا پھلوں والا تھیلہ لیے بیچ چوراہے میں کھڑا ہے۔ سکندر

ہر چند اُس سے خفا رہتے تھے ۔ لیکن کچھ حالات کے تحت نرم لہجے میں انہوں نے آگے بڑھ کے پھلوں کی قیمت اس سے پوچھی ۔ اس نے ہمیشہ کی طرح دام دوگنے بتائے ...... سکندر کا پارہ چڑھ گیا۔ غصے میں آپے سے باہر ہو گئے بولے ۔

" ابے تیرا دماغ اب بھی ٹھیک نہیں ہوا ... لوگ باگ کہتے تھے کہ تیرے جیسے سب مر کھپ گئے ۔ پر تو تو کھڑا ہے ویسا ہی کا ویسا .... تجھ میں تو کوئی فرق نہیں پڑا۔ ویسا ہی بے ایمان اور جھوٹا ہے تو ، تو ... "

پھر کچھ سوچ کر بولے " ٹھہر جا ! نکلنے دے اب کے کرفیو پھر سے ... اللہ چاہے گا تو ہم جرور ہی تجھے اپنے "ناپاک " ہاتھوں سے کھتم کریں گے "

مشکل یہ ہے کہ سکندر بات کی تہہ میں کبھی جاتے ہی نہیں ہیں ۔ نہ اُن کو جھگڑنے کی نوعیت سے غرض تھی ۔ اور نہ محاورے کے غلط استعمال سے ۔

ایک دن بازار سے لوٹے تو ذرا خوش نظر آئے ۔ کچھ مسکراتے جاتے تھے اور خلافِ عادت کام بھی کچھ دل لگا کے کر رہے تھے ۔ وہ زمانہ رمضان کا تھا ۔ علی گڑھ یونیورسٹی میں روزہ کھولنے کے لئے ، شام کو سورج غروب ہونے پر سائرن بجایا جاتا ہے ۔ گھر والے جب شام کو کھانا کھانے کے کمرے میں جمع ہوئے تو سکندر بولے ۔

" ایک نئی دوکان بازار میں کھلی ہے ۔ بڑی بڑھیا مٹھائیاں بنتی ہیں وہاں ۔ اور صاحب لوگ باگ تو کہتے ہیں کہ دہی کی لسی تو مشہور ہے ۔ وہاں کی ایسی لسی تو سارے شہر میں کوئی نہیں بنا سکتا ۔ جیسی یہ حلوائی بناتا ہے "

پوچھا گیا " تم نے بھی چکھی ہے وہ لسی ! یا سُنی سُنائی تعریف کر رہے ہو ؟ "

سکندر بولے "صاحب! کل شام تک تو ہمارا ارادہ تھا، لسی پینے کا، لیکن پھر وہ بات ایسی ہو گئی کہ ارادہ بدلنا پڑا۔"

"کیوں بھئی! ایسی کیا بات ہو گئی؟"

بولے "کل شام جب ہم بازار سے سودا خرید کے اس حلوائی کی دوکان کے سامنے سے گزرے تو سائرن بجنے لگا..... حلوائی نے ہمیں آواز دے کے کہا کہ بھائی سکندر میاں! لسّی تیار ہے۔ آئیے روزہ کھولتے جائیے.... ہم نے کہا "بھائی صاحب! آپ کی لسّی کی تعریف تو ہم بھی سنی ہے۔ اور آپ کہتے ہیں تو ضرور ہی آپ کی لسّی ایک نمبر کی ہو گی۔ ہمارا دل لسّی پینے کو بھی چاہ رہا ہے۔ لیکن کیا کریں۔ ہم بہت مجبور ہیں.... ہم لسّی سے روزہ کیسے کھول سکتے ہیں.... یوں کہ ہمارا تو روزہ ہی نہیں ہے....."

٭٭٭

سکندر دوا لینے گئے

کچھ دنوں سے سکندر کسی گہری سوچ میں کھوئے کھوئے سے نظر آتے تھے۔ اور چلتے پھرتے اپنی عادت کے مطابق اپنے آپ سے کچھ باتیں بھی کرتے جاتے تھے۔ ایک دن دوپہر کو کام کاج سے فارغ ہو کے میاں سکندر اپنی کوٹھری میں حسبِ معمول آرام کرنے کی غرض سے جا کے لیٹے ہی تھے کہ اچانک گھر کی مالکن کی طبیعت خراب ہو گئی اور سکندر کو فوراً ہی دوا لینے بازار کی ڈسپنسری جانا پڑا ۔ سکندر کو اپنے آرام کے وقت کسی کی دخل اندازی بالکل پسند نہیں ہے۔ لیکن وہ وقت ایسا تھا کہ چپ چاپ انہوں نے اپنی سائیکل سنبھالی اور گھر سے نکل گئے ۔ تین بجے سہ پہر میں وہ روانہ ہوئے تھے۔ قاعدے سے گھنٹے بھر میں ان کو واپس آجانا چاہئے تھا لیکن جب وہ دو گھنٹے تک بھی واپس نہ آئے تو دوسرے ملازم کو دوا لینے کیلئے

بھیجا گیا، وہ نوکر دوا لے کے آبھی گیا۔ مریضہ کو دوا بھی دیدی گئی۔ اور انکی طبیعت بھی سنبھل گئی۔ شام کے بعد رات آگئی۔ بتیاں جل گئیں۔ آٹھ بجنے کو آئے لیکن سکندر کا دُور دُور تک کوئی پتہ نہ تھا۔ گھر والوں کو شروع میں ان کا انتظار رہا پھر اُن پر غصّہ آنے لگا۔ اور وہ جب بھی نہ پہنچے تو ان کی طرف سے پریشانی شروع ہو گئی.....۔

لگ بھگ نو بجے سکندر گھر میں داخل ہوئے۔ کچھ لنگڑا کے چل رہے تھے پا جامے کا پائینچہ موڑ موڑ کر اونچا کر رکھا تھا۔ پنڈلی پہ ہلکا سا کھُلا ہوا زخم نظر آرہا تھا۔ اور وہ سائیکل کو کچھ اس طرح پکڑے ہوئے تھے جیسے وہ سائیکل کو نہیں بلکہ سائیکل ان کو سہارا دے کر یہاں تک لائی ہو۔ ایسے موقع پر غصّے کی گنجائش تو تھی نہیں۔ سب لوگ ان کی طرف پریشانی سے دیکھنے لگے۔ دوسروں کو اپنے متعلق پریشان دیکھ کے سکندر کے چہرے پہ عجیب سا فخر برسنے لگا اور سائیکل کو دیوار سے ٹکا کے وہ بڑی شان سے آگے بڑھے۔

"ارے یہ کیا ہوا؟" گھر کے مالک نے بڑی حیرت سے ان سے پوچھا۔

سکندر اپنی پنڈلی کے زخم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے۔ جیسے وہ زخم نہیں بلکہ اُن کی کسی بہادری کا تمغہ ہے۔ "جی — یہ؟ اس کا تو ایک قصّہ ہے۔ ابھی سُناتے ہیں۔"

مالک نے غصّہ سے کہا۔ "قصّے کہانی کو چھوڑو۔ یہ بتاؤ کہ یہ ہوا کیا؟"

سکندر مسکرا کے بولے۔ "ابھی بتاتے ہیں۔ ذرا صبر کیجئے۔ ابھی سارا معاملہ آپ کو سمجھاتے ہیں۔"

" ارے معاملہ کیا، کمبخت! جلدی سے بتا کہ یہ چوٹ کیسے آئی؟"

" چوٹ بٹ" سکندر نے اس طرح مایوسی سے کہا جیسے اُن کے پاؤں کے زخم کو محض چوٹ کہہ کے اُن کی توہین کی گئی ہو۔ بولے " ارے صاحب! یہ چوٹ ہے۔ اس کو چوٹ کہتے ہیں؟"

صاحب نے غصّے سے کہا " سکندر! بکواس بند کرو۔ اور جلدی سے بتاؤ کہ ہوا کیا؟"

سکندر بولے " ہوتا کیا صاحب! ہم شروع آخر سے آپ کو سُناتے ہیں کیا ہوا ــــ ہم دوپہر کو کھانا کھا کے اپنی کوٹھری میں گئے اور ہم نے کہا کہ بھائی سکندر اب تو ڈھائی بجنے والے ہیں۔ چار بجے چائے دینا ہوگی۔ تمہارے پاس وقت کم ہے۔ جلدی سے سونے کی کوشش کرو۔ لیکن ۔ ۔ ۔ ۔"

" لیکن ویکن کیا؟ ــ تمہارا پروگرام کون پوچھ رہا ہے۔ بس سیدھے سیدھے جلدی سے یہ بتاؤ کہ تمہیں چوٹ کیسے لگی ہے؟"

سکندر ذرا جھنجھلا کے بولے " جب تک شروع سے نہیں بتائینگے ہم پوری بات ۔ ۔ ۔ ۔ آپ کی سمجھ میں پوری بات نہیں آئے گی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہوا یہ کہ ہم کوٹھری میں سونے کے لئے لیٹے ہی تھے کہ سغری آگئی ہمیں جگانے۔ ہم نے کہا بھلا تو عورت ذات، تجھے کس نے کہا تھا کہ تو ہماری کوٹھری میں دن دہاڑے گھس آئے ۔ ۔ ۔"

سغری بولی " سکندر جلدی سے اُٹھ۔ دیکھ بیگم صاحب کی طبیعت خراب ہو گئی ہے۔ جلدی سے دوا لے کے آ"

" اب صاحب! ہم کیا کرتے ۔۔! ہم نے کہا چل بھائی سکندر چل۔
پر صاحب! اس گھر کا بھی عجیب حال ہے ۔ چوبیس سال سے ہم یہاں ہیں۔
ایک عجیب بات جو ہم نے گھر والوں میں دیکھی ہے اور جو ہم کو بے حد کر کے
ناپرسند (ناپسند) ہے وہ یہ ہے کہ یہاں بیمار ہونے کا نہ تو کوئی وقت ہے نہ
کوئی ٹیم (ٹائم) ایسے بے ڈھب وقت میں بیمار ہونے کا فِی شن (فیشن) اس
گھر میں چلتا ہے کہ ہم کیا کہیں ۔۔ کبھی آج تک کوئی ہم کو بیمار ہونے سے پہلے کوئی
اطلاع، کوئی کھبر نہیں دیتا ہے ۔ اور جب جی چاہے ہے، رات ہو کہ دن ہو،
آرام سے بیمار پڑ جاوے ہے اور پھر مصیبت آوے ہے سکندر کی "

صاحب سکندر کی بات پہ جھنجھلا اُٹھے، بولے۔

" ارے سکندر! دماغ مت چاٹ ۔۔ اپنی فضول کی باتیں بند کر اور صرف
اتنا بتا دے کر یہ تکلیف تجھے کیسے ہوئی ۔۔ ؟ "

سکندر بولے ۔

" صاحب! ۔۔ صبر کیجئے ۔۔ اب ہم اسی تکلیف کے معاملے پہ آنے
والے ہیں . . . . پھر یہ ہوا کہ جب ہم کو اطلاع ملی کہ بیگم صاحب کو سر کا دورہ
اُٹھ گیا ہے تو ہم بھی اُٹھ گئے ۔ ہم نے اپنی کوٹھری میں تالہ لگایا ۔ اندر آ کے سائیکل
اٹھائی اور دروازے سے باہر نکل گئے ۔۔ مصرا (ڈسپنسری کا مالک) سے
ہم نے دوا لی ۔۔ اس کو پیسے دیئے ۔ ریزگاری سنبھال کے جیب میں رکھی ۔ دوا
کی شیشی تھیلے میں ڈالی اور روانہ ہو گئے گھر کے لئے ۔۔ جب ہم پُلیا کے پاس پہنچے
تو ہماری سائیکل کی چین اُتر گئی ۔۔ اب تو ہم عجیب مصیبت میں پھنس گئے تھے ۔

ہم نے لاکھ کوشش کی ۔ پر کسی طرح بھی وہ چین ہم سے نہیں سنبھلی ۔ تو ہم کو سامنے کی دوکان سے بھائی صاحب محمد شکور نے پکارا ۔"

" بھائی صاحب محمد شکور کون ؟"

" وہ ایک سائیکل کی مرمت کرنے والے ہیں ۔۔ ان کو لوگ باگ تو محمد شکور کہہ کے پکارتے ہیں ۔ لیکن ہم سے ان کی پرانی ملت داری (دوستی) ہے ۔ اس لئے ہم ان کو بھائی صاحب محمد شکور کہہ کے خضاب (خطاب) کرتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔"

"خضاب کرتے ہیں!" سن کر بے اختیار ہم سب کو ہنسی آگئی ۔

سکندر کو ہم لوگوں کی ہنسی پسند نہیں آئی ۔ ۔ ۔ ۔ تیوری پہ بل ڈال کے بولے ۔

" اب صاحب ! چاہے تو آپ لوگ ہنس لیجئے ۔ چاہے تو ہمارا قصہ سن لیجئے ۔"

" اچھا اچھا ۔ قصہ سناؤ بھئی ۔"

" ہاں تو ۔ ۔ ۔ ۔ کہاں پہ ختم کی تھی ہم نے بات ؟ " سکندر نے اِدھر اُدھر دیکھ کے پوچھا ۔

صاحب نے ذرا ناگواری سے کہا " سکندر تمہارا دماغ بالکل ہی خراب ہو گیا ہے ۔ تم تو ایسی بے تکی باتیں کرتے ہو ، جیسے تمہیں کسی کُتّے نے کاٹ کھایا ہو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

سکندر یہ سن کے جھوم ہی تو گئے ۔ ۔ ۔ ۔ بہت حیرت سے آنکھیں پھاڑ کے

مسکرائے اور بولے ۔

" ارے صاحب ! ۔ آپ تو بڑی جلدی سمجھ گئے ہیں ۔ مگر ہمیں کسی کُتّے نے نہیں، ایک کُتیا نے کاٹ کھایا ہے، یہ اسی کا توزخم ہے "۔

" ارے ۔ رے ۔ رے " صاحب بدحواس ہو کے بولے " چہ .... چہ .... چہ ..... کیا تجھے کُتّے نے کاٹ کھایا ہے؟"

" جی نہیں کُتّے نے نہیں کتیا نے کاٹا ہے " سکندر مسکرا کر بولے ۔

صاحب گھبرا کے بولے ۔

" اتنی دیر سے کھڑا کھڑا اُلٹی سیدھی باتیں کر رہا ہے .... اور یہ نہیں بتاتا کہ کتّے نے کاٹا ہے ۔ ارے جلدی سے بڑے ہسپتال جا میرا خط لے کے۔ اور فوراً ہی انجیکشن لگوا "۔

سکندر بولے " ارے صاحب ! پورا قصّہ تو سُن لیجئے اُن بے چاری کُتیا کی کوئی خطا نہیں تھی۔ وہ تو پُلیا کے نیچے اپنے چھوٹے چھوٹے بچّوں کو لئے ہوئے چپ چاپ لیٹی ہوئی تھیں .... پہلے تو انہوں نے ہماری طرف نظر اٹھا کے بھی نہیں دیکھا تھا ۔ لیکن جب ہم نے سائیکل پُلیا کے سہارے کھڑی کی تو وہ سمجھیں کہ شاید ہم اُن کے دشمن ہیں ۔ اور شاید ہم اُن کے بچوں کو کوئی نقصان پہنچانے آئے ہیں بس جب ان کو یہ غلط فہمی ہو گئی تو وہ آگے بڑھیں اور ہماری طرف غصّے سے دیکھ کے بھونکنے لگیں ۔ اور جلدی جلدی دُم ہلانے لگیں ۔ ہم دوسری طرف دیکھنے لگے تو وہ سمجھیں کہ ہم جان بوجھ کے اُن کے بچّوں کو ستانے کے لئے آئے ہیں ۔ اور بس پھر وہ آگے بڑھیں اور آگے بڑھ کے اُنہوں نے

ہماری پنڈلی پہ اپنا مُنہ مارا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور جب تک ہم شور مچائیں وہ پُلیا کے نیچے اپنے بچّوں کے پاس واپس چلی گئیں ۔ اور ہم اکیلے کھڑے رہ گئے ۔
جب بھائی صاحب محمد شکور نے یہ وارجات (واردات) دیکھی تو وہ ہمارے پاس آئے اور بولے ۔

" بھائی سکندر کیا ہوا ؟ "

ہم نے کہا " ہوتا کیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ جو پُلیا کے نیچے کُتیا لیٹی ہوئی ہیں ، انہوں نے غلط فہمی میں یہ سمجھا کہ ہم شاید ان کے بچّوں کے دشمن ہیں ۔ اور شاید انکے بچوں کو نقصان پہنچانے آئے ہیں ۔ اور پھر غصّے میں آکے اُنھوں نے ہماری پنڈلی پہ کاٹ کھایا ۔ ۔ ۔ "

" ارے ۔ ۔ ۔ رے ۔ ۔ ۔ رے " بھائی صاحب محمد شکور بولے " اب کیا ارادہ ہے ۔ بھائی سکندر میاں ؟ "

ہم نے کہا " بھائی سکندر میاں کیا کر سکتے ہیں ۔ اَب تو جو اللہ میاں کی مرضی ہوگی وہی ہوگا "

" پھر بھی تمہیں کُتّے کے کاٹے کے ٹیکے تو لینا ہوں گے ۔ ۔ ۔ کُتّے کا کاٹا بہت خطرناک ہوتا ہے " وہ بولے ۔

سکندر مُسکرا کر بولے ۔

" صاحب ۔ ہم نے بھائی صاحب محمد شکور کی یہ بات سُن کے اُن سے کہا کہ بھائی صاحب ! آپ سمجھتے ہیں کہ مجھے پتہ نہیں ہے کہ کتّے کے کاٹے کے کیا کیا خطرے ہوتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ہم اس بارے میں سب جانتے ہیں ۔ پر اوّل تو ہم کو کسی

کُتّے نے دشمناگی میں نہیں کاٹا ہے ۔ بلکہ ایک کُتیا نے غلط فہمی میں کاٹا ہے ۔ ان کی بھی کوئی خطا نہیں ۔ ان کو ہمارے بارے میں شک پڑ گیا تھا کہ ہم شاید اُن کے بچوں کو نقصان پہنچانے آئے ہیں ۔ اور بس وہ بیچاری تو اپنے بچّوں کی محبت میں ماری گئیں "

لیکن بھائی صاحب محمد شکور بولے کہ " سکندر ! وہ کہاں ماری گئی مارا تو تُو گیا ہے "

ہم نے کہا " بھائی صاحب ! ہم تو کاش خدانخواستہ مرنے والوں میں سے ہیں نہیں ۔ اور جو اگر آپ کا کہنا ٹھیک ہے اور ہم کو کچھ ایسی ویسی بات ہو گئی تو پھر آپ دیکھ لیجئے گا اِن کی (کُتیا) کی بھی خیر نہیں رہے گی "

بھائی صاحب بولے " سکندر میاں ! ہم نے سُنا ہے کہ پاگل کُتّے کے کاٹے کا خطرہ ہوتا ہے "

ہم بولے " ہاں صاحب ! ہم نے بھی یہی سُنا ہے ۔ اسی لئے ہم ان کو (کُتیا کو) ابھی پکڑ کر اپنے ساتھ لے جاتے ہیں ۔ ان کو اپنے گھر میں رکھیں گے ۔ اور دیکھیں گے کہ کاش خدانخواستہ یہ پاگل تو نہیں ہیں "

بھائی صاحب نے کہا " یہ ٹھیک ہے سکندر میاں ! لیکن آپ ان کو گھر لے جائیں گے تو ان کے چھوٹے چھوٹے بچّوں کا کیا ہوگا ۔ ۔ ۔ ۔ ابھی تو ان کی آنکھیں بھی نہیں کھُلی ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ "

ہم بولے " چہ ۔ چہ ۔ چہ ۔ ابھی آنکھیں بھی نہیں کھُلی ہیں ۔ میں نے تو سُنا تھا کہ سات دن کے بعد آنکھیں کھلتی ہیں ۔ اس کے مطلب تو یہ ہوئے بھائی صاحب کہ ابھی

ان کے بچّے سات دن کے بھی نہیں ہوئے.... چہ .... چہ ... چہ ... چہ .....
جبھی تو بیچاری اپنے بچّوں کی محبّت میں ماری گئیں "۔
بھائی صاحب بولے "دیکھو سکندر میاں! تم تو اللہ کا نام لے کے جاؤ
میں روز ان کو دیکھتا رہوں ۔ تم بے فکر رہو۔ اگر یہ پاگل واگل ہو گئی تو میں تم کو
اطلاع نہ دوں گا۔"
سکندر بولے "ہم نے کہا اور بھائی صاحب اگر کاش خدانخواستہ
ہمیں کچھ ہو گیا تو ۔ ؟"
بھائی صاحب بولے "کیا ہو جائے گا ؟"
سکندر نے کہا "یعنی اگر ہم مر گئے تو ؟"
بھائی صاحب نے کہا "بے فکر رہو سکندر میاں! ان کو (کتیا کو) یہیں
چھوڑ جاؤ ۔ اور اطمینان سے گھر جاؤ ... مرنے کی بات مت کرو ۔ ویسے اگر تم مر گئے
تو اس کی ذمّہ داری ہم لینے کو تیار ہیں"۔
سکندر نے بڑے فخر سے چاروں طرف دیکھا اور بولے ۔
"تو صاحب! اب ڈر کاہے کا ۔ اب تو ہم خطرے سے باہر ہیں ۔ یوں کہ
ہمارے مرنے کی ذمّہ داری بھائی صاحب محمد شکور نے لے لی ہے ۔ مانتے ہیں ۔
بڑے شریف آدمی ہیں بھائی صاحب محمد شکور "۔

٭

سکندر گئے میلہ گھومنے

ایک دن صبح ہی صبح سکندر گھر کی مالکن کے کمرے میں پہنچے اور اُن سے دَو دن کی چھٹی مانگنے لگے۔

مالکن نے کہا "ابھی ایک ہی مہینہ تو ہوا ہے۔ تم محرم کرنے اپنے گھر گئے تھے دس دن کی چھٹی لے کے گئے تھے اور پندرہ دن میں لوٹے تھے۔ نہ۔ نہ۔ اب تو تمہیں چھ مہینے سے پہلے چھٹی ملے گی نہیں "

" چھ مہینے " سکندر حیرت سے بولے " ارے بیگم صاحب۔ چھ مہینے کے مطلب تو یہ ہوئے کہ پورے آدھے سال تک ہم ایک ہی جگہ قید بُھگتیں گے "

بیگم صاحب خفا ہو کے بولیں " کیا باؤلے ہوئے ہو۔ ہمارا گھر قید خانہ ہے تمہارے لئے "؟"

سکندر نے اطمینان سے جواب دیا۔" ارے صاحب! جہاں آدمی کو آنے جانے اور گھومنے گھامنے کی چھٹی نہ ملے تو وہ گھر قیدخانہ نہیں تو اور کیا ہے؟"

غصہ تو مالکن کو بہت آیا سکندر کی بات پر۔ لیکن چونکہ پچیس سال سے سکندر کے منہ سے ایسے ہی پھول جھڑتے تھے۔ اس لئے اس بارے میں اُن سے کچھ کہنا سننا بیکار تھا۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد سکندر نے اپنی بات دہرائی کہ اُن کو دو دن کی چھٹی ضروری دے دی جائے۔

" جانا کہاں ہے آخر؟" پوچھا گیا۔

بولے " ذرا سوَن کے میلے جائیں گے۔"

" سوَن کے میلے — ارے بیوقوف وہ بھی کوئی میلہ ہوتا ہے۔ ابھی اگلے مہینے میں نمائش لگنے والی ہے وہ دیکھنا۔"

لیکن سکندر بھلا کہاں ماننے والے تھے۔ بولے " جی — یہ نمائش بھی کوئی نمائش ہوتی ہے۔ پچیس سال سے دیکھتے چلے آ رہے ہیں۔ نہ کوئی نئی بات نہ کوئی پرانی بات۔ وہی ہمیشہ کے ہمیشہ ایک سی نمائش ہووے ہے۔ ایک طرف کباب پراٹھے والے چیخیں ہیں۔ دوسری طرف سرکس کے ہاتھی گھوڑے شور وغل مچائیں ہیں۔ شروع آخر سے دیکھتے آ رہے ہیں ہم یہ نمائش۔ کوڑی کام کی نہیں ہوتی ہے یہ نمائش۔"

میں نے کہا" سکندر یاد رکھنا۔ اس بار اگر نمائش کے زمانے میں تم بدحواس ہو ہو کے نمائش دیکھنے گئے تو اچھا نہیں ہوگا۔ نمائش کے زمانے میں تو تمہارے ہوش وحواس بجا نہیں رہتے ہیں۔ آپے سے گزر جاتے ہو۔ سارے گھر کا کام چوپٹ ہو جاتا ہے۔ اور آج ایک معمولی سے نوٹنکی والے میلے کے لئے نمائش میں

کپڑے ڈال رہے ہو"
سکندر ہنس کر بولے "ارے بی بی — سون کے میلے میں نوٹنکی والی بات نہیں ہوتی ہے۔"
"کیا تم پہلے بھی سون کا میلہ دیکھ چکے ہو؟" میں نے پوچھا۔
"ارے صاحب! لوگ باگ بات چیت کرتے ہیں تو ہم بھی سن لیتے ہیں، ویسے ہم سے تو متھری (گھر کی مہترانی) نے اس میلے کی بڑی تعریف کی ہے۔"
"متھری کی تعریف پہ تم سون کا میلہ دیکھنے چلے ہو؟ ۔ اس سے پہلے تم ہمیشہ متھری سے جھگڑتے رہتے تھے۔ اب اس سے میلے ٹھیلے کی بات چیت بھی ہونے لگیں۔ مبارک ہو" میں نے ذرا طنز سے کہا۔
سکندر بولے "بات چیت کی کیا بات ہے — متھری ہم کو اپنے ساتھ لے چل رہی ہے۔"
"ہائے۔ ہائے" میں نے کہا "اب تمہاری یہ اوقات رہ گئی ہے کہ بھنگن کے ساتھ میلہ دیکھنے جاؤ گے۔"
"اس میں اوقات کی کیا بات ہے بی بی۔ ہجاروں لاکھوں پبلک میلہ دیکھنے جائیں گی — ہم بھی جائیں گے۔ متھری بھی جائیں گی۔ وہ اپنی راہ لیں گی۔ ہم اپنی راہ لیں گے۔"
"لیکن سکندر! یہ تو بتاؤ کہ آخر متھری سے تمہاری اِن دنوں اتنی کیوں بننے لگی ہے؟" میں نے پوچھ ہی لیا۔
سکندر تھوڑا شرمائے پھر مسکرائے۔ پھر بولے "بات یہ ہے بی بی کہ

ہم نے سُنا ہے کہ متھری کا آنا جانا بڑے بڑے گھروں میں ہوتا رہتا ہے۔ اور بڑے گھروں میں آپ جانیں ہیں کہ لونڈیاں، باندیاں بہت پالی جاویں ہیں تو ۔ ۔ ۔ ۔" سکندر کچھ ہچکچا کے چُپ ہو گئے۔

" اچھا ۔ اچھا یہ بات ہے، جب تو ٹھیک ہے ۔ ضرور متھری کے ساتھ جاؤ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مگر کب ہو رہی ہے تمہاری شادی ؟ ۔" میں نے ہنستے ہوئے پوچھا ۔

سکندر بہت سنجیدگی سے بولے ۔

" اب شادی اور بیاؤ (بیاہ) اور نکاح اور منگنی کسی کے ہاتھ میں تو ہے نہیں ۔ وہ جو کسی نے کہا ہے کہ جب گھر میں بیری ہوگی وِس میں تو ڈھیلے اُدبدا کے گریں گے ہی ۔"

" تو تم بیری ہو ؟ " ایک بچّے نے ہنستے ہوئے پوچھا ۔

سکندر خفا ہو کر بولے " دیکھیے کوکو میاں ۔ آپ ٹھہرے بچّے ۔ اور بچّے شروع آخر سے ایسی باتوں میں نہیں بولتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بیری کا تو ایک پیڑ ہوتا ہے ۔ اس پیڑ میں بیری کے پھل لگتے ہیں ۔ ۔ ۔ پھر جب بیری توڑنا ہوتی ہے تو کچھ لوگ ڈھیلے اور پتھر مار مار کے بیری توڑتے ہیں ۔ اسی موکھے (موقع) پر یہ کہاوت بولی جاوے ہے ۔ ۔ ۔ ۔" سکندر سمجھانے کے انداز میں بولے۔

جب سکندر کو ہر طرح سے ساون کے میلے میں جانے سے روکنے کی ناکام کوشش کر لی گئی تو مجبوراً ان کو دو دن کی چھٹی دے دی گئی ۔ اور وہ خوشی خوشی اپنا بستر باندھ کے اسٹیشن روانہ ہو گئے ۔ ۔!

وہ سردی کے دن تھے۔ جنوری کی ٹھنڈی، برفیلی ہواؤں کے جھکڑ چل رہے تھے۔ رات بھر کی بوندا باندی کے بعد ہلکی سی دھوپ نکلی تھی تو گھر والے صحن میں خوب اوڑھ پہن کے دھوپ سینکنے بیٹھے تھے۔ گیارہ بجے کا وقت تھا کہ دو دن کے بعد میاں سکندر گھر میں داخل ہوئے ۔۔ اور خلاف عادت جلدی جلدی ہم سب سے نظریں بچاتے ہوئے باورچی خانے کی طرف بڑھنے لگے۔ لیکن بچّوں نے انہیں راستے ہی میں روک لیا۔

" ارے سکندر! تمہارا یہ کیا حال ہے؟ " ایک بچے نے پوچھا۔

سکندر نے بولنے کی کوشش کی مگر ان کا گلا بیٹھا ہوا تھا۔ مُنہ زکام کی وجہ سے سرخ ہو رہا تھا۔ آنکھیں اُن کی سوجی سوجی نظر آ رہی تھیں اور وہ صرف ایک کورٹ پہنے ہوئے سردی سے کانپ رہے تھے اور اُن کے دانت کٹ کٹ بج رہے تھے۔

اس حال میں دیکھ کے اُن سے کسی نے بات چیت نہ کی۔ اور فوراً اپنی کوٹھری میں جا کے کھاٹ پہ لیٹ رہے.... جب باورچی اُن کو چائے دینے گیا تو بتاتا تھا کہ سکندر میاں بُخار میں بھُن رہے ہیں، اور اول فول بک رہے ہیں۔

دو تین دن کے بعد سکندر ٹھیک ٹھاک ہو گئے۔ اور تیسرے چوتھے دن جب وہ صبح کے ناشتے پہ بقول اپنے ڈیوٹی پہ حاضر تھے تو اُن سے سوہن کے میلے کی روداد پوچھی گئی ۔۔ میلے کے متعلق اُن کی پہلے والی ساری گرمجوشی ختم ہو چکی تھی۔ اور انہوں نے میلے کے نام پہ ایسا بُرا منہ بنایا جیسے اُن کے منہ میں اچانک

کونین کی گولی رکھ دی گئی ہو۔

میں نے پوچھا ۔" سکندر! ۔ سون کا میلہ تو خوب گھومے، بہت شاندار تھا نا؟"

سکندر جل کے بولے۔

" ارے توبہ کیجئے بی بی ۔! وہ کوئی میلہ تھا؟ بس یوں سمجھئے کہ ہمارے گاؤں کی پینٹھ بھی اس سے سو ہجار گُنا برتر (بہتر) ہوتی ہے۔ پر وہ جو کہا ہے نا کسی نے کہ وہی ہوتا ہے جو منجورِ خُدا ہوتا ہے۔ تو بس آپ یوں سمجھ لیجئے کہ ہم تو یوں سمجھے کہ شاید ہمارا آخری وقت آ پہنچا ہے۔ اور شاید ہم حشر کے میدان میں پہنچ گئے ہیں ۔ دریا کے کنارے ایک بڑے سے میدان میں ہر طرف گاؤں والے تھے۔ اور ہر طرف گائے بھینسیں اور بیل گھاس چر رہے تھے۔ دراصل میں وہ جانوروں کی نمائش تھی جسے لوگ باگ مویشیوں کی نمائش بولتے ہیں۔ ہم کچھ اور سمجھے تھے وہاں کچھ اور ہی نجّارہ تھا۔

" منتھری نے ہم کو آدھی بات بتائی تھی ۔ گائے بیلوں کی بات بتاتی تو کیا ہم کوئی بے وقوف تھے جو نہ جان نہ پہچان، بڑی خالہ سلام کہہ کے سون کا میلہ دیکھنے چلے جاتے۔ بڑا آیا سون کا میلہ کہیں کا ۔!" سکندر نے تیوری پہ بل ڈالتے ہوئے کہا۔

" مگر سکندر!" میں نے کہا " منتھری کی کیا خطا؟ ۔ تمہیں خود ایسی اُلٹی سیدھی جگہوں پہ جانے کا شوق رہا ہے۔ اتنا منع کیا سب نے تمہیں۔ مگر تم بھلا ماننے والوں میں سے تھے"

سکندر کچھ قائل ہو کے بولے ۔

"مانتے ہیں صاحب! بڑی غلطی ہو گئی ہم سے ۔ ہم کسی اور ہی خیال سے وہاں گئے تھے ۔ وہاں دوسرا ہی نجارہ نکلا ۔"

میں نے پوچھا ۔

"آخر وہ کون خیال تھا جو تمہیں وہاں لے گیا؟"

سکندر کچھ دیر سر جھکائے زمین کی طرف دیکھتے رہے پھر کچھ شرماتے ہوئے بڑے قائل لہجے میں بولے ۔

"بی بی! بات یہ ہے کہ متھری نے ہم سے میلے کی بڑی تعریف کی تھی اور اس بات کا بھی اکین (یقین) دلایا تھا . . . ."

"کس بات کا یقین؟" میں نے پوچھا ۔

متھری کو سامنے آتے دیکھ کر سکندر نے بڑی بیزاری سے اس کی طرف دیکھا ۔ مگر متھری بھی ایک ہی ڈھیٹ بڑھیا تھی ۔ جھاڑو بغل میں دبائے سکندر کے پاس آکھڑی ہوئی ۔

سکندر پرے ہٹتے ہوئے بولے ۔

"انہوں نے (متھری نے) ہم کو بتایا تھا کہ سون ندی کے کنارے سال میں ایک دفعہ میلہ لگتا ہے ۔ اور آس پاس کے تمام گاؤں والے بلکہ اچھے اچھے کھاتے پیتے لوگ باگ اپنے اپنے بال بچوں کے ساتھ میلہ دیکھنے آتے ہیں اور بڑی رونق وہاں لگتی ہے . . . . . اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ لوگ باگ شادی بیاہ کی بات بھی وہیں نکال دیتے ہیں . . ."

"اچھا، اچھا ۔ تو یہ شادی بیاہ کا خیال تھا؟ تمہارا پرانا مرض! جو تمہیں سوَن کے میلے میں لے گیا۔ مگر بھئی! بیوی تو ساتھ لائے نہیں! تم تو اپنی دری اور کمبل بھی کھو آئے وہاں، اور الٹا بخار لے کے آگئے۔ کسی لڑکی والے سے بات چیت بھی ہوئی کہ نہیں؟"

سکندر بولے۔

"یہی تو بات ہے ساری۔ آپ پورا قصہ تو سنیئے۔۔۔۔ ہوا یہ کہ آپ تو جانیں ہیں کہ آج تک ہمارا گھر نہیں بسا ہے۔ اور ہماری شادی بیاؤ بھی نہیں ہوئی ہے اور اب جات برادری میں کچھ ایسا نام ہمارا نکل گیا ہے اور ہمارے بھانجے بھانجیوں کے بچّے بھی بیاہ گئے ہیں۔ کہ کوئی آدمی ہم کو اپنی بیٹی دینے کو تیّار نہیں ہوتا ہے تو ہم نے کہا چل بھئی سکندر اب جنگل سروبانوں (بیابانوں) میں قسمت کی آزمائی کر ـــ اور متھری نے ہم کو بتایا تھا کہ ایسے میلوں ٹھیلوں میں ہر سال بھیڑ بھڑکّے کے موکھے پر عورتیں وورتیں بہت کھو جاتی ہیں۔ اور گھر والے ان کو صبر کر کے اپنے گھروں کو لوٹ جاویں ہیں ۔ تو کبھی کبھی ایسی ہی کھوئی ہوئی عورتیں پردیسیوں کے ساتھ آنے جانے کو تیار ہو جاویں ہیں ـــ تو صاحب ہم بھی اسی کھیال میں میلے چلے گئے تھے۔ پر وہاں کا تو عجب رنگ ہے ـــ لڑکی بالی تو دور رہی۔ وہاں تو کسی کے کان کی بالی بھی نہ کھوئی ـــ ہم دو دن تک اسی ارمان میں رہے کہ کاش خدانخواستہ کوئی تو عورت اس بھیڑ بھڑکّے میں کھو جائے ـــ مگر بھیڑ بھڑکّے کے موکھے پر تو عورتیں ہی الٹا ہم کو دھکّے دیتی آگے بڑھتی جاویں تھیں۔۔۔۔۔۔ ایک بڈھی سی عورت ہم سے بولی۔

"آ اللہ اشنان کر لے۔ پاپ دھل جائیں گے۔"
ہم نے کہا۔ "مائی۔ ہم کوئی پاگل ہیں جو اس ٹھنڈے پانی میں نہائیں گے۔"
بڑھیا بولی۔ "کیا تو ناستک ہے؟"
ہم بولے۔ "ہم کیوں ہوتے ناجگ، بس اپنا اپنا دل ہے ــــ نہ نہائیں گے۔"
اس کا بڈھا بولا ــــ "ناجک نہ پوچھے ہے، بڑھیا پوچھے ہے کیا تو ناستک ہے ــــ؟"
"یہ ناستک کیا ہووے ہے؟" ہم نے پوچھا۔
بڈھے نے کہا۔ "ناستک اس کو کہوے ہیں جو بھگوان کو نہ مانے ہے۔"
ہم نے کہا۔
"بھگوان کو ماننے سے ہم کو کوئی انکاری نہیں ہے ــــ ہم بے شک بھگوان کو مان سکتے تھے ــــ لیکن کیا کریں ہم بہت مجبور ہیں اور بہت پریشان ہیں۔ یوں کہ ہم مسلمان ہیں۔"
"رام ــــ رام ــــ رام۔" بڑھیا نے کہا اور بولی۔ "اے للہ۔ ذرا پرے ہٹ کے کھڑا ہوا۔"
اور بس بی بی ــــ! رات بھر اسی چکر میں ہم پھنسے رہے ــــ اور خوب سردی ہمیں لگتی رہی ــــ پھر جب ہم نے مڑ کے دیکھا تو ہمارا کمبل غائب تھا ــــ اور بی بی ــــ! قسمت کا لکھا یوں پورا ہوا ہمارا کہ کاشش خدانخواستہ عورت جات تو کوئی کھوئی نہیں، ہمارا کمبل البتہ کھو گیا۔ کیا

کریں۔ مجبوری کا نام شکریہ ۔"

⁂

سکندر اور سکندر لال

سکندر عام طور پر بڑے بزدل اور بے وقوف واقع ہوئے ہیں اور لمبی لمبی
باتیں بس زبانی ہی کرتے رہتے ہیں ۔ کہیں ہاتھا پائی یا مار پیٹ کا موقع آجائے
تو یہ اس سے کوسوں دور بھاگتے ہیں ۔ لیکن اپنے خیال میں وہ خود کو انتہائی
بہادر سمجھتے ہیں۔ اور کبھی کبھی بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ ۔
" لوگ باگ جانتے ہیں کہ ہم کتنے خطرناک آدمی ہیں "
اُن کی اس بات پر اُن کے جاننے والوں کو بے اختیار ہنسی آجاتی ہے ۔
ایک دفعہ دہلی میں ایک بہت نیک اور سیدھے سادے پوربی چپڑاسی
فتح بہادر سے اُن کا جھگڑا ہو گیا۔ چونکہ سکندر اس وقت اکیلے تھے اس لئے انہوں نے
چپ ہو جانا ہی غنیمت جانا اور خاموشی سے سرونٹ کوارٹرز سے اُٹھ کر گھر میں

داخل ہو گئے لیکن چپراسی کی طرف سے ان کا دل صاف نہیں تھا۔ اس لئے انکے چہرے سے پتہ چلتا تھا کہ اندر ہی اندر کُڑھ رہے ہیں۔ شام کو اتفاق سے وہ چپراسی کسی کام سے گھر میں داخل ہوا۔ ہمارا گھر اُس زمانے میں مٹکاف ہاؤس (دہلی) میں تھا جو جمنا کے کنارے واقع ہے ـــ سکندر نے جب اچھی طرح اپنا اطمینان کر لیا کہ وہ گھر میں اور گھر والوں کی پناہ میں بالکل محفوظ ہیں، تو اُنہوں نے فوراً تیور بدل لئے۔ اور فتح بہادر کا ہات پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے ہم لوگوں کے بالکل سامنے لے آئے اور بولے

" دیکھئے صاحب ـــ ان کو سمجھا دیجئے ـــ یہ ہمارے مُنہ نہ لگا کریں۔ ورنہ ہم ٹھہرے خطرناک آدمی ـــ کیا فائدہ ہوگا کہ ہمیں آجائے گا غصّہ ـــ اور نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگ باگ دیکھیں گے کہ اسی جمنا میں دو لہاشیں (لاشیں) تیر رہی ہیں۔ ایک ان کی اور ایک ہماری "

گرمیوں کی ایک رات سب گھر والے کھانے کے بعد صحن میں بیٹھے ہوئے گپ شپ کر رہے تھے کہ اچانک سکندر گھبرائے ہوئے گھر میں داخل ہوئے۔ ان کا چہرہ فق تھا۔ مُنہ پہ ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور مارے ڈر کے ان کی گھگھی بندھی ہوئی تھی ـــ سامنے آکے بولے۔

" وہ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ سیاپ پھر آگئے "

چونکہ ہم لوگ جان گئے تھے کہ سیاپ سے سکندر کا مطلب کوئی صاحب نہیں بلکہ سانپ ہے۔ لہٰذا سب لوگ گھبرا کے باہر بھاگے۔ باہر آکے دیکھا کہ سکندر کی کھاٹ کے پاس زمین پہ سکندر کا تکیہ پڑا ہے۔ اس سے کچھ فاصلے پر

اُن کی دری پڑی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور اس کے قریب ہی اُن کا حقہ اوندھے مُنہ پڑا ہے ـــــ سکندر آگے بڑھ کے جلدی سے کھاٹ پہ چڑھ گئے اور وہیں سے کانپ کانپ کے بولے ۔

" دیکھیے ہم اپنی کھاٹ پہ بیٹھے ہوئے حقّہ پی رہے تھے کہ ہم نے دیکھا کہ ایک سیاپ ہماری کھاٹ کی طرف بڑھے چلے آ رہے ہیں ۔ ہم نے اُن کو روکنے کیلئے اپنا تکیہ پھینکا جو اُن کی دُم پہ پڑا ۔ لیکن وہ بڑے ڈھیٹ تھے اور دم کو ہلکا سا جھٹک کے وہ پھر بڑھے ہماری طرف ۔ اس بار ہم نے اپنی دری لپیٹ کے ان کی طرف پھینکی ۔ پہلے تو وہ دری میں لپٹ گئے ۔ پھر جو دیکھا تو دری کے کونے سے نکلے چلے آ رہے ہیں ہماری طرف ـــــ اب ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ ہم کیا کریں ـــــ ؟ لے دے کے ہمارے پاس ایک حقّہ رہ گیا تھا ـــ آخر میں ہم نے اپنا حقہ بھی سیاپ کے سامنے ڈال دیا ـــ اور جب وہ اس میں لپٹنے لگے تو ہم کھاٹ کے دوسرے کنارے سے کود کے اُترے اور سیدھے سیدھے گھر میں آئے کہ آپ لوگوں کو اطلاع دے آئیں کہ سیاپ پھر آئے ہیں "

ظاہر ہے کہ سکندر کے قابلِ احترام ملاقاتی یعنی سیاپ نے اُن کی خاطر اور تواضع کا کوئی نوٹس نہیں لیا تھا ، نہ اُن کی دری اور تکیہ پہ آرام کیا تھا اور نہ حقے کے دو کش لیے تھے ۔ بلکہ سادھو سنتوں کی طرح بس ایک درشن دے کر کہیں اُلوپ ہو گئے تھے ۔

سکندر اب تک حیران ہیں کہ عجیب سیاپ تھے وہ کہ اُن کی اتنی خاطرداری کے باوجود اتنی دیر بھی ٹھہرنے پہ راضی نہ ہوئے کہ کوئی آ کے اچھی طرح سے اُن کی

آخری خاطر کر سکتا ۔

سکندر کو دن تاریخ اور سال کے بارے میں بھی کچھ علم نہیں ہے ۔ نہ وہ ان باتوں کو معلوم کرنے یا سمجھنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ اسی وجہ سے اپنی عمر کے بارے میں بھی اُنہیں کچھ پتہ نہیں ہے ۔ اور ہم لوگ بھی کچھ اندازہ نہیں کر سکے ہیں کہ سکندر کی عمر کیا ہے ۔ عام طور سے عمر بڑھنے کا اندازہ انسان کے چہرے مہرے اور اس کی سوجھ بوجھ سے لگایا جاتا ہے ۔ سکندر کے معاملے میں اس طرح کا کوئی اندازہ نہیں لگایا جا سکتا ہے ۔ اس لئے کہ اُن کے چہرے مہرے اور اُن کی سوجھ بوجھ پہ بے وقوفی کے سوا کوئی دوسری چھاپ نہیں پائی جاتی ہے ۔

بال کچھ سفید ہو چکے ہیں جس کے لئے وہ کہتے ہیں کہ جب سے ہم کو جو کھام (زکام) کا مرض پیدا ہو جانے کا اندیشہ پیدا ہوا ہے، اسی وقت سے ہمارے بال سفید ہونے لگے ہیں ۔۔ اپنے دانت ٹوٹنے کی اطلاع وہ اکثر دیتے رہتے ہیں۔ لیکن عجیب و غریب بات یہ ہے کہ دیکھنے والے کو دور دور تک اس کا گمان نہیں گزرتا ہے کہ سکندر کا کوئی ایک دانت بھی کم ہوا ہے ۔ ان کے دانتوں کی بناوٹ اس حقیقت کی تردید کرتی نظر آتی ہے کہ عام طور سے انسانی دانتوں کی تعداد بتیس ہوتی ہے ۔ کبھی گننے کا اتفاق تو نہیں ہوا ہے ۔ لیکن سکندر کو کبھی کبھی بے اختیار ہنستے دیکھ کر یہ خیال ضرور ہوتا ہے کہ سکندر کے دانتوں کی تعداد یقیناً بتیس ۳۲ سے زیادہ ہے ۔ یا پھر اُن کے مُنہ میں کوئی ایسا غیر معمولی، زرخیز مادہ ہے جو ایک دانت ٹوٹنے پر ڈیڑھ دانت اگا دیتا ہے ۔ بظاہر یہ ڈیڑھ دانت والی بات عجیب سی معلوم ہوتی ہے ۔ لیکن جن لوگوں نے ان کو کھل کر ہنستے دیکھا ہے وہ اس کی گواہی دے سکتے ہیں کہ سکندر کے ایک

دانت پہ ڈیڑھ دانت ہی کا شبہ ہوتا ہے۔ اور سال میں ایک آدھ بار جب وہ اپنی ہی کسی بات پہ تالی بجا کے بے تحاشہ ہنستے ہیں تو آس پاس والے اُن کے ارد گرد سے ہٹ جاتے ہیں۔ محض اس خیال سے کہ کہیں سکندر کے اَن گنت دانت بارش کے اولوں کی طرح چھٹک کے اِدھر اُدھر کسی پہ نہ گرنے لگیں۔

بال اور دانت کے علاوہ سنا ہے عمر کا اثر انسان کی بینائی پر بھی پڑتا ہے لیکن سکندر اس معاملے میں بھی دوسروں سے مختلف ہیں۔ انہوں نے دنیا میں دیکھا ہی کیا ہے جو اُن کی نگاہ کمزور ہوتی۔ البتہ کبھی کبھی بغیر کسی وجہ کے اُن کی آنکھ سُرخ ہو جاتی ہے اس کی بھی ان کو قطعی کوئی پریشانی نہیں ہوتی ہے۔ جب کوئی کہتا ہے۔

"بھئی سکندر! تمہاری آنکھ لال کیوں ہے؟"

جواب دیتے ہیں "ہم کو کیا خبر صاحب — ہم کوئی آنکھوں کے ڈاکٹر ہیں —!"

پوچھا گیا "تم کو کوئی تکلیف تو نہیں ہوتی؟"

بولے "— آنکھ کا معاملہ ہے صاحب . . . . تکلیف ہوگی تو وہیں ہوگی۔ ہمیں تو کاش خدانخواستہ کوئی تکلیف نہیں ہے۔"

ایک دفعہ سکندر کسی ضروری کام سے علی گڈھ سے دہلی جا رہے تھے۔ گرمی کا موسم تھا اور دوپہر کا وقت — شاید اُن کی آنکھ جھپک گئی۔ غازی آباد کے اسٹیشن پر اُن کی آنکھ کھلی تو انہوں نے دیکھا کہ مسافروں کی تلاشی ہو رہی ہے اور پولیس کے دو تین آدمی اِدھر اُدھر مسافروں کے سامان کی چھان بین کر رہے ہیں۔ پہلے تو سکندر نے نیند کے جھونکے میں ان باتوں کا کوئی نوٹس ہی نہیں لیا۔ لیکن جونہی

پولیس کانسٹبل پر نظر پڑی فوراً اُٹھ بیٹھے۔ کانسٹبل نے سکندر کو غور سے دیکھا اور ذرا کڑے لہجے میں پوچھا۔

"تمہاری آنکھ کیوں لال ہے؟"

سکندر نے لاپروائی سے آنکھیں ملتے ہوئے جواب دیا۔

"ہم کوئی... غیب کا علم پڑھے ہیں کہ آپ کو بتادیں کہ ہماری آنکھیں کیوں لال ہیں؟"

سکندر نے ایسے لہجے میں بات کی تو کانسٹبل نے اور بھی زیادہ سخت لہجے میں کہا۔

"بکواس بند کرو، اور جلدی سے نکال کے سامنے دھر دو۔ چھپانے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا"

سکندر نے ہکا بکا ہو کر پوچھا "ہمیں چھپانے سے کیا فائدہ ہوگا۔ یہ تو آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ لیکن پہلے یہ تو بتلایئے کہ ہم آپ سے کیا چھپا رہے ہیں؟"

کانسٹبل نے کہا "وہی۔ کوکین — !"

"کوکین — ؟" سکندر چونک کر بولے "کوکین تو سنا ہے کوکین پھروشوں کے پاس ہوتی ہے۔ ہمارے پاس کہاں سے آئی؟"

کانسٹبل نے کہا "بک بک مت کرو — صاف صاف جواب دو"

سکندر نے کہا۔

"آپ بحث کیجئے ہم سے — ہم جواب دیں گے۔ اور صاف صاف دیں گے — ہم پیچھے ہٹنے والوں میں سے نہیں ہیں۔"

کانسٹبل نے کہا "تم علی گڈھ سے آرہے ہو؟"
سکندر نے کہا "آں ہاں ۔ ہم علی گڈھ سے آرہے ہیں"
کانسٹبل نے سوچ کے کہا "ہمیں پتہ چلا ہے کہ علی گڈھ سے کوکین چلی ہے"
سکندر نے حیرت سے پوچھا۔
"بھلا کوکین بھی کوئی گاڑی ہے کہ موٹر ہے جو چلے گی ..... یوں کہیئے کہ ضرور ہی اس قصے میں کسی کوکین فروش کا ہاتھ ہے"
کانسٹبل نے کہا "یہی تو ہم معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ اس ڈبے میں کوکین فروش کون ہے؟"
سکندر اِدھر اُدھر مسافروں کو دیکھتے ہوئے بولے "بھئی! آپ لوگوں میں سے جو صاحب کوکین پھروش ہوں سامنے آجائیں"
مسافروں کو بے اختیار ہنسی آگئی ۔ کانسٹبل کو بھی غصہ آگیا۔ اس نے جھنجھلاتے ہوئے سکندر سے کہا "تمہیں دوسروں سے کیا مطلب ... ہم تو تم ہی سے اگلوالیں گے"
سکندر اپنے گلے پہ ہات پھیرتے ہوئے بولے "ہمیں آپ نے کیا کوکین نگلوائی ہے جو اگلوالیں گے .....؟" پھر کچھ سوچ کے سکندر بولے "بھئی دیوان جی جھگڑا ختم کرو اور بتاؤ کہ آپ کو ہم پہ کیا شبہ ہے؟"
دیوان جی نے کہا۔
"تمہاری آنکھیں لال ہیں اور جو نشہ کرتا ہے اس کی آنکھیں لال ہوتی ہیں اس لئے ہمیں آپ پہ شُبہ ہے"

سکندر نے مسافروں سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا ۔
" لو صاحب ۔ اور سُنو ۔ جس کی آنکھ لال ہوتی ہے وہ نشہ کرتا ہے ۔ اس کے مطلب یہ ہوئے کہ ہمارے علی گڈھ میں جو اتنا بڑا آنکھوں کا ڈاکٹر موہن لال کا ہسپتال ہے، تو وہاں آنکھوں کے مریض نہیں بلکہ کوکین فروش بھرتی ہونے کو آتے ہیں "

کانسٹبل اور سکندر کا جھگڑا شاید آگے بھی بڑھتا ۔ لیکن اسی وقت کوئی اسٹیشن آگیا اور ایک آدمی نے اندر آکر کانسٹبل سے کہا ۔
" تم غلط ڈبے میں آگئے ۔ اس سے آگے والے ڈبے میں مال پکڑا گیا ہے ۔ جلدی چلو "

کانسٹبل یہ سنتے ہی جلدی سے سکندر سے آنکھیں ملائے بغیر پلیٹ فارم پہ اُتر گیا اور گاڑی رینگنے لگی ۔

ایک دن گھر میں سکندر کی عمر کے بارے میں کچھ بات چلی ۔۔۔ ہر ایک اپنا اپنا اندازہ بتاتا تھا ۔ آخر میں کہا گیا کہ اس سلسلے میں خود سکندر سے کیوں نہ پوچھا جائے سکندر بلائے گئے ۔ میں نے پوچھا ۔
" سکندر ! تمہاری عمر کیا ہے ؟ "

معلوم نہیں سکندر نے کیا سنا یا سمجھا ۔ فوراً ہی اُن کی آنکھیں دیوار پہ لگی ہوئی گھڑی پہ ٹک گئیں ۔ ۔ ۔ سب لوگ ہنسنے لگے تو سکندر کچھ سمجھے اور بولے ۔
" ہم کچھ اور سمجھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ خیر چھوڑیئے ۔ پھر سے پوچھیئے "
میں نے کہا " سکندر ! بات یہ ہے کہ تم اتنے دنوں سے ہمارے گھر میں ہو

لیکن ہم میں سے کسی کو پتہ نہیں ہے کہ تمہاری عمر کیا ہے ؟ "

بولے " یہ بھی آپ ٹھیک ہی کہتی ہیں بی بی ۔ آج اس بات کا بھی جرور ہی کوئی فیصلہ ہو جانا چاہیئے "

میں نے کہا " اچھا تو بتاؤ تمہاری عمر کتنی ہے ؟ "

بولے " صاحب ...... ٹھیک ٹھیک تو یاد نہیں ہے ۔ لیکن ہمارے ماں باپوں نے بتایا ہے کہ جس سال کالی آندھی آئی تھی اسی سال ہم پیدا ہوئے تھے "

" کالی آندھی ؟ " میں نے گھبرا کے پوچھا ۔

سوچ کے بولے " ارے نہیں بی بی ۔ کالی آندھی کے سال میں تو ہمارا بھائی پیدا ہوا تھا ۔ ہم تو جانیں جس سال رام گنگا میں باڑھ آئی تھی ۔ ہم اس سال پیدا ہوئے تھے "

" رام گنگا میں باڑھ ۔ ؟ " میں نے پھر حیرت سے پوچھا ۔

بولے " ارے نہیں بی بی ۔ ہم بھول گئے ۔ باڑھ والے سال تو ہماری بہن پیدا ہوئی تھی ۔ ہم تو جس سال ، اِن پُلندہ (انفلوئنزا) پھیلا تھا ، اُس سال پیدا ہوئے تھے "

" انفلوائنزا ؟ " میں نے اس بار بھی چونکتے ہوئے پوچھا ۔

سکندر بڑی خوشی اور فخر سے بولے ۔

" جی ہاں ۔ جس سال اِن پُلندہ پھیلا تھا ۔ ہم اسی سال پیدا ہوئے تھے کہتے ہیں کہ ایک طرف تو لوگ پاگ دھڑا دھڑ مر رہے تھے ..... دوسری طرف ہم پیدا ہوئے تھے ... مگر وہ جو کسی نے کہا ہے کہ جسے اللہ رکھے اُسے کون چکھے ۔

تو یہ تو وہی مجمون (مضمون) ہو گیا کہ ؎

مرزائی (مدعی) لاکھ بُرا چاہے تو کیا ہوتا ہے
خدا کو جو منظور ہو گا وہ تو ہو کے رہے گا ...."

میں نے پوچھا "یہ مرزائی کون تھا؟"
سکندر سوچ کے بولے۔

"ہم تو جانیں ہیں، اُس جمانے میں اِن ڈپلندہ کا نام مرزائی بھی پڑ گیا ہو گا۔ بیماری کا کوئی ایک نام تو ہوتا نہیں ہے صاحب ..... پھر نام بدلتے بھی تو رہتے ہیں ۔ آپ خود دیکھئے ۔ پہلے جسے اِن ڈپلندہ (انفلوائنزا) کہتے تھے اب اُسے لوگ باگ فالو (فلو) کہنے لگے ہیں .... پہلے اس کا علاج جوشاندہ سے ہوتا تھا۔ اب تو ایسا چکر چل گیا ہے کہ جب تک ڈاکٹر لوگ اِن ڈپلندہ میں ونسلین (پنسلین) کے ای نکسن (انجیکشن) نہیں لگاتے ہیں تب تک ہماری جان ہی نہیں چھوٹتی ہے۔"

دلی میں ایک بار سکندر اسی ان ڈپلندہ (انفلوائنزا) میں مبتلا ہو گئے۔ دو دن تک تو معمولی دوا دارو سے ان کا علاج ہوتا رہا۔ لیکن جب تیسرے دن بھی اُن کا بخار نہیں اُترا بلکہ ٹمپریچر پہلے سے بھی کچھ زیادہ ہونے لگا تو سکندر نے مایوس ہو کے کہا۔

"بی بی ۔ ہم تو جانیں ہمارا وقت پورا ہو گیا۔"

میں نے کہا "کیوں بے وقوفی کی بات کرتے ہو ۔ بھلا تمہارا وقت ابھی کیسے پورا ہو سکتا ہے؟"

سکندر فوراً ہی بولے۔

" یہ بھی آپ ٹھیک کہتی ہیں ۔ کائدے (قاعدے) سے تو ابھی ہم کو نہیں مرنا چاہیئے۔ ابھی ہم نے دیکھا ہی کیا ہے ...... ابھی تو نہ ہماری منگنی ہوئی نہ شادی۔ نہ بیاؤ (بیاہ)، نہ نکاؤ (نکاح) "

میں نے سکندر کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

" بالکل ٹھیک کہتے ہو تم .... مرنے سے پہلے یہ تمام باتیں تو ضرور ہی پوری ہو جانی چاہئیں ۔ ویسے میں تم کو ابھی ڈاکٹر کے پاس بڑے ہسپتال میں بھجواتی ہوں ۔ جلدی ٹھیک ہو جاؤ گے "

وہ زمانہ ۱۹۵۰ء کا تھا۔ اور سکندر ۱۹۴۷ء کے بعد پہلی بار دہلی آئے تھے ۔ اور تین سال کی مدت میں اب جا کر ان کو معلوم ہوا تھا کہ ۱۹۴۷ء میں مسلمانوں اور سکھوں کے درمیان بدمزگی ہوئی تھی ۔

جب ان کو ہسپتال بھیجنے کے لئے ٹیکسی منگائی گئی تو انہوں نے سکھ ٹیکسی ڈرائیور کو دیکھتے ہی فوراً میری طرف دیکھا اور بجائے ٹیکسی میں بیٹھنے کے چبوترے کی سیڑھیوں پہ ہی بیٹھ رہے ..... پھر میری طرف بڑھ کے بہت دھیرے سے بولے۔

" بی بی ۔ یہ تو سردار جی ہیں "

" پھر کیا ہوا؟ " میں نے حیرت سے کہا۔

سکندر نے کہا۔

" ہم کو مبارک بھیّا نے بتایا تھا کہ جب دلّی جاؤ اور کسی سردار جی کا سامنا ہو

تو اپنی شناخت مت بتانا۔"

میں نے جھنجھلا کر کہا۔

"کیسی شناخت؟"

سکندر بولے۔

"یہی نام کی شناخت؟"

میں نے کہا۔ "اس کے کیا مطلب ہیں بھئی؟"

مجھے سمجھاتے ہوئے سکندر بولے۔

"مبارک نے کہا تھا جب تم سے کوئی سردار تمہارا نام پوچھے تو اصلی نام مت بتانا بلکہ اپنا نام سکندر لال بتانا۔"

"سکندر لال ....!" میرا ہنسی سے برا حال ہو گیا۔

مجھے ہنستے دیکھ کر وہ بولے۔

"ارے .... رے .... رے .... بی بی۔ ہنسے مت۔ ہنسنے سردار جی کو جرور ہی کچھ شبہ پڑ جائے گا ہماری بابت۔"

میں اب اکتا چکی تھی۔ اور جلدی سے قصہ ختم کرنا چاہتی تھی۔ اس لئے میں نے سکندر سے کہا۔

"تم اگلی سیٹ پر خوب اوڑھ پہن کے بیٹھ جاؤ۔ میں پیچھے کی سیٹ پر بیٹھتی ہوں۔ ہسپتال جلدی پہنچنا چاہیئے۔ ورنہ ڈاکٹر صاحب چلے جائیں گے۔"

اب سکندر کو ذرا حوصلہ ہوا۔ اور وہ ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ ٹیکسی آدھا راستہ طے کر چکی تو ٹیکسی ڈرائیور سردار جی نے یوں ہی وقت گزاری کے خیال سے سکندر

سے پوچھا۔

"آپ کا شبھ نام — ؟"

سکندر نے میری طرف پیچھے مڑ کے دیکھا اور اپنے خیال میں سردار جی سے نظر بچا کے بولے۔

"دیکھ لیا آپ نے — ہم نہ کہتے تھے سردار جی کو ہمارے نام پہ جرور ہی شُبہ پڑے گا۔ اب وہ خود پوچھ رہے ہیں کہ آپ کے نام کا کیا شُبہ ہے؟"

مجھے ہنسی تو بہت آئی مگر میں چپ چاپ بیٹھی رہی۔

سردار جی نے دوبارہ پوچھا۔

"آپ کا نام کیا ہے جی!"

اب سکندر نے جی کڑا کر کے کہا۔

"ہمارا نام سکندر لال ہے۔"

سردار جی گاڑی آہستہ کرتے ہوئے اس بار واقعی شُبہے سے سکندر کو دیکھا اور بولے۔

"سکندر لال؟ — لیکن آپ تو مسلمان معلوم ہوتے ہیں۔"

سکندر نے تقریباً روہانسو ہوتے ہوئے کہا۔

"یہ بھی آپ ٹھیک کہتے ہیں۔"

*

سکندر نینی تال گئے

سکندر کو قدرتی مناظر وغیرہ سے بالکل کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ کالی گھٹا
ٹھنڈی ہوا، رنگین شفق، لہریہ دھنک، بہتا ہوا جھرنا، ابھرتا ہوا چاند۔ چڑیوں
کا چہکنا ..... یہ سب کچھ انہیں بالکل نہیں بھاتا ہے۔ ایک بار برسات کے
موسم میں کسی نے ان سے کہا۔

"سکندر! دیکھو کیسی گھٹا چھائی ہے۔"

بُرا سا مُنہ بنا کر بولے۔

"آں ہاں، گھٹا چھائی ہے۔ دیکھ رہے ہیں ہم بھی۔ اب برسنے پہ آوے گی
تو مصیبت کھڑی کر دیوے گی۔ ہر طرف کیچڑ ہو جائے۔ پھسل پھسل کے لوگ باگ
الگ گریں گے۔"

کسی نے کہا "آج چودھویں کا چاند ہے ۔ کتنا خوب صورت لگ رہا ہے "

سکندر نے بیزاری سے کہا ۔

" سمجھ میں نہیں آتا آخر اس کمبخت چاند میں کھاص بات کیا ہے، جو سب اسکو دیکھیں ہیں ۔ چالیس سال سے ہم اس کو دیکھتے آ رہے ہیں ... نکلتا ہے ... ڈوبتا ہے ۔ آخر اس میں کھاص بات کیا ہے ؟"

گرمیوں کی چھٹی میں جبکہ ہم لوگ نینی تال میں تھے ۔ ایک دن بیٹھے بٹھائے پک نک کا پروگرام بن گیا ۔ اور کھُرپا تال ، نینی تال سے چند میل نشیب میں واقع ایک خوب صورت سی وادی میں جانا طے ہوا ۔ سکندر کو معلوم ہوا تو بہت بد دلی سے انہوں نے پک نک کا سامان تیار کرنا شروع کیا ۔ بہت خفگی سے بولے ۔

" سمجھ میں نہیں آتا ، یہ بیگم صاحب کو بیٹھے بٹھائے کیا ہو جاتا ہے ؟ ... اچھا بھلا گھر چھوڑ کر جنگل میں جانے کا پروگرام بنا لیتی ہیں ۔ بھلا پوچھو .... اچھی خاصی میز کرسی چھوڑ کے وہاں کوڑے کرکٹ پہ بیٹھ کے کھانا کھائیں گی ۔ تال کے گندے پانی سے ہاتھ دھوئیں گی ۔ گھاس پر اُٹھیں بیٹھیں گی ــ پھر آنے جانے میں جو تھکن ہوگی ، سو الگ "

آخر کار اسی طرح بُدبُداتے اور بڑبڑاتے ہوئے سکندر ہم لوگوں کے ساتھ کھرپا تال روانہ ہوئے ۔ جب کافی دیر ہو گئی اور سکندر کا مزاج بدستور کڑوا رہا تو ہم میں سے کسی نے اُن کو خوش کرنے کی خاطر ان سے کہا ۔

" ارے سکندر ، دیکھو تو کیسا خوب صورت منظر ہے ــ ! "

سکندر نے تیوری پہ بل ڈال کے کہا۔

"کدھر۔؟ کدھر ہے منجر۔؟"

کہا گیا۔" دیکھو وہ سامنے کتنی خوب صورت پہاڑی ہے۔ مویشی کس قدر خوشی سے اِدھر اُدھر گھوم پھر رہے ہیں۔ وہ چرواہا۔ اپنی بانسری لئے درخت کی شاخ پر بیٹھا ہے۔ سامنے جھرنا بہہ رہا ہے۔"

سکندر نے بہت ہی بُرا مُنہ بنا کے کہا۔

"لو صاحب! یہ منجر ہو گیا۔ اس میں کیا کھاص بات ہے۔ سامنے ایک اینٹ پتھر کا ٹیلہ ہے۔ اُس پہ گائے بیل گھاس چر رہے ہیں۔ ایک گندہ، غلیظ کالا سا چھوکرا پیڑ پہ اُچھل کود رہا ہے۔ اور ابھی جو شاخ ٹوٹ جائے اور آپڑے بچّہ مُنہ کے بل جمین (زمین) پر تو پتہ چلے گا کہ چرواہا کسے کہتے ہیں۔ جھرنے کا کیا ہے۔۔۔ پانی اوپر سے گرے ہے تو نیچے کو آدے ہی ہے۔ سدا کا یہی قاعدہ ہے دنیا کا۔ آپ اسے جھرنا بنائے دیں ہیں۔ اب ہم آپ کو کیا بھرمائیں۔"

سکندر کو قدرتی مناظر کے بعد اگر کسی چیز سے "بے حد کر کے" نفرت ہے تو وہ چھوٹے چھوٹے بچّے ہیں۔ کہتے ہیں۔

"صاحب، سمجھ میں نہیں آتا۔ آخر بچوں کا فائدہ کیا ہے؟۔ ہر وقت دنگا فساد مچاتے رہتے ہیں۔ لڑتے، جھگڑتے ہیں، اور ہر وقت اُن کی دیکھ بھال الگ کرنا پڑتی ہے۔"

جس گھر میں بچوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے وہاں جانے سے سکندر ہمیشہ بچتے ہیں ایک بات یہ بھی ہے کہ بچے بھی سکندر کے ساتھ اس طرح کا سلوک نہیں کرتے ہیں،

جیسے کسی جیتے جاگتے انسان سے کیا جاتا ہے ۔ گھر اور محلے بھر کے بچے سکندر کو ایک انوکھی مخلوق سمجھتے ہیں۔ اور آئے دن سکندر کو اپنی شرارتوں کا نشانہ بناتے رہتے ہیں کبھی موقع پا کر سکندر کی سائیکل گھسیٹتے ہیں۔ کبھی سکندر کی نظر بچا کے ان کا حقہ چھپا دیتے ہیں۔ کبھی سکندر کو بے خبر پاکر اُن کی ٹوپی جھپٹ لیتے ہیں۔ اس وقت سکندر کا غصہ دیکھنے کے قابل ہوتا ہے۔ اور وہ معصوم بچوں کی شان میں ایسے ایسے الفاظ کہتے سُنے جاتے ہیں کہ اگر بچوں کی مائیں سُن لیں تو سکندر کے ہوش ٹھکانے لگ جائیں لیکن بچے ان کی گالیوں سے بہت لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اور سکندر کا بُرا بھلا کہنا تو انہیں کسی دلچسپ کھیل کا ایک حصہ معلوم ہوتا ہے۔

میرے بچے سے سکندر عام طور سے خفا رہتے ہیں۔ یہ بچہ غیر معمولی طور پر سنجیدہ ہے۔ لیکن سکندر کو دیکھتے ہی اس کی خاموشی اور سنجیدگی ایک دم غائب ہو جاتی ہے۔ اور سکندر کو ستانے میں وہ سب سے آگے رہتا ہے۔ چنانچہ آئے دن سکندر اور اس بچے کے جھگڑے کا فیصلہ مجھے کرانا پڑتا ہے۔ . . . . دراصل سکندر اس بچے سے اس کی پیدائش کے ڈیڑھ دو ماہ بعد ہی سے خفا رہتے ہیں

اس خفگی کے پیچھے ایک قصہ یہ ہے کہ جب بچہ تقریباً ڈیڑھ ماہ کا تھا تو ایک دن اُس کی آیا ایک دو دن کی چھٹی لے کر اپنے گاؤں چلی گئی۔ مجھے کسی ضروری کام سے ڈیڑھ دو گھنٹے کے لئے گھر سے باہر جانا تھا۔ ناچار میں نے سکندر سے کہا کہ وہ میری غیر حاضری میں بچے کے پاس بیٹھے رہیں اور اس کی نگرانی کریں۔ خلافِ عادت سکندر نے حامی بھر لی۔

ڈیڑھ گھنٹہ بعد میں لوٹی تو بچے کے کمرے سے سکندر کے بات کرنے کی آواز سُن کے

میں کمرے کے باہر ٹھٹھک گئی۔ سکندر بچّے کے پاس بیٹھے ہوئے بڑی سنجیدگی سے اُس سے مخاطب تھے ؛

" ہم آپ سے اتنی دیر سے بات کر رہے ہیں۔ اور آپ چپ ہیں۔ آخر ماجرا کیا ہے۔ آپ اگر کوشش کریں تو ضرور ہی بول سکتے ہیں "

بچہ ہنس پڑا۔ تو سکندر کا حوصلہ اور بڑھا۔ اور وہ کہنے لگے۔

" جب آپ ہنس سکتے ہیں تو بولنے میں ایسا کونسا زور پڑے گا آپ پر ؟ ہم اتنی دیر سے یہاں اکیلے بیٹھے بیٹھے قید بھگت رہے ہیں۔ اور آپ ہیں کہ چپ چاپ پڑے ہیں — بس اِن ہی باتوں کی وجہ سے تو ہمیں بچّے بے حد کرکے ناپسند ہیں "

میں اندر داخل ہوئی تو سکندر اسٹول سے اس طرح تھکے ہارے اُٹھے جیسے کوسوں کا سفر طے کر کے آئے ہوں۔ جماہی لے کے بولے۔

" ارے بی بی — بڑی کڑی ڈیوٹی آج آپ نے ہماری لگا دی.... ہم تو اکیلے بیٹھے بیٹھے عاجز آ گئے۔ عجیب بچّے ہیں یہ بھی — ... نہ اپنی کہیں — نہ ہماری سُنیں "

بچہ دو تین سال کا تھا کہ ایک دن میری ایک بزرگ ملنے والی آگئیں انہوں نے جیسا کہ بڑوں کا قاعدہ ہے بچّے کو گلے سے لگایا۔ اور اس کو دعائیں دیتی ہوئی بولیں۔

" ارے بس ایک ہی بچّہ ہے "

میں نے مجرموں کی طرح سر جھکا لیا، تو وہ اور بھی زیادہ ہمدردی کرنے لگیں۔

" ارے ایک بچہ بھی کوئی بچے میں بچہ ہوتا ہے۔ چار پانچ بچے تو کم سے کم گھر میں ہونے ہی چاہئیں۔ بچوں ہی سے تو گھر کی رونق ہوتی ہے "

جب وہ اس طرح کی باتیں کر رہی تھیں تو سکندر بھی چائے پانی وغیرہ پلانے کے سلسلے میں کہیں آس پاس بھٹک رہے تھے۔ اور ہماری بات چیت سُنتے جاتے تھے۔ اُن بی بی کے جانے کے بعد سکندر میرے سامنے آکے کھڑے ہوئے اور بولے۔

" لیجئے اور سُنیئے۔۔۔۔۔ کہے جا رہی تھیں کہ بس ایک ہی بچہ ہے۔ ارے صاحب ایک بچے نے تو آفت مچا رکھی اور جبہ کا س! خدانخواستہ دو ایک اور ہوتے تو سمجھئے قیامت آجاتی اس گھر میں تو۔۔۔۔۔۔ یہ تو ایک بھی بھاری ہے سو بچوں پہ "

میں تو خیر سکندر کے اندازِ گفتگو سے واقف تھی۔ اس لئے مجھے تو بڑا لطف آیا، اُن کی اس بات سے۔ لیکن بچے کی دادی اور نانی نے اس دن سکندر کو بڑے آڑے ہاتھوں لیا۔

سکندر کو اپنی زندگی میں صرف ایک چھوٹی سی بچی سے قدرے دلچسپی پیدا ہوئی تھی۔ اس کی بھی ایک داستان ہے۔ ہمارے گھر میں تین پُشتوں سے ملازموں کا ایک خاندان رہتا ہے۔ ایک ملازمہ ہے جس کی نانی کو میری نانی نے قحط کے زمانے میں خرید کے پالا تھا۔ اس کی بیٹی کو میری والدہ نے پالا پوسا، اور اس کی شادی کر دی۔ یہ شادی ایسی مبارک ثابت ہوئی اور اولاد کا ایسا سلسلہ بندھا کہ ہمارے گھر میں گھر والے کم اور اس ملازمہ کا خاندان زیادہ نظر آنے لگا۔ اس کا شوہر بڑا نکما اور کام چور تھا۔

سکندر جس دن ہمارے ہاں نوکری کرنے کی نیت سے آئے تھے اُس سے

بس ایک ماہ پہلے ہی اُس ملازمہ کی شادی ہوئی تھی۔ سکندر کو اس بات کا بڑا
قلق تھا کہ وہ ایک ماہ چوک گئے۔ ورنہ سغری (ملازمہ کا نام) کا بیاہ انہیں
سے ہوتا۔ اتفاق کی بات جب ۴۳-۱۹۴۲ء میں لڑائی کا عروج تھا۔ ایک دن
سغری کا کوئی طعنہ سن کر اس کا شوہر "مبارک" فوج میں بھرتی ہو گیا اور اچانک
لام پر چلا گیا۔ کچھ عرصہ تک اُس کا کچھ پتہ نہ چلا۔ آخر میں دو تین مہینے تک اس نے
سغری کو کچھ رقم بھیجی خرچے کی ..... اب سغری بہت فخر محسوس کرنے لگیں، اور
سکندر کو اور بھی زیادہ حقیر سمجھنے لگیں، کہ سکندر تو ایک معمولی گھریلو ملازم ہی تھے۔
اور اس کا شوہر ایک مانا ہوا فوجی تھا۔ آئے دن سکندر اور سغری کی جھڑپ
ہوتی رہتی تھی۔

ایک دن دوپہر کو جب گھر والے کھانا کھا رہے تھے تو اچانک ایک
پولیس کانسٹبل ایک سرکاری نوٹس لے کے آیا۔ جس پہ درج تھا کہ "مبارک خاں
مرحوم کے بال بچوں کو اطلاع دی جاتی ہے کہ وہ لام پر کام آ گئے وغیرہ وغیرہ"۔
اتفاق سے وہ نوٹس سکندر کے ہاتھ میں پڑا۔ بجائے افسوس کرنے کے
وہ بے حد فخر اور خوشی سے گھر میں داخل ہوئے اور سغری سے مخاطب ہو کے
بولے۔

"لو بڑا ہر وقت فوج فوج کرتی رہتی تھیں۔ اب دیکھ لو ہو گئے نا مبارک خاں
بھی محروم (مرحوم)"۔

سغری بے چاری بچھاڑیں کھانے لگی۔ اس کے چھوٹے چھوٹے سے بچے سہم کر
رہ گئے۔ سارے گھر والے سغری کو دلاسہ دینے لگے ..... کئی دن تک گھر پہ بڑا

سوگ طاری رہا۔

دھیرے دھیرے لوگ باگ اس واقعے کو بھولنے لگے۔ صرف سغری غریب اب بھی روتی رہتی تھی۔ اس نے چوڑیاں توڑ ڈالی تھیں۔ سفید کپڑے پہننے لگی تھی اور خود کو..... بیوہ کے روپ میں اس نے ڈھال لیا تھا۔

سغری کی سب سے چھوٹی بیٹی افسری اُس وقت ڈھائی تین سال کی تھی۔ بڑی تندرست سی بچی تھی۔ توتلا توتلا کے بولتی تھی اور بڑی بھولی لگتی تھی۔

سکندر رات دن سغری کو دم دلاسہ دیتے رہتے تھے، لیکن سغری اُن کا نوٹس ہی نہ لیتی تھی۔ آخر سوچ بچار کے سکندر نے ایک ترکیب نکالی کہ افسری پہ وہ بہت توجہ صرف کرنے لگے۔

افسری کو سکندر بڑے "چاؤ" سے "بیٹی" کہتے تھے۔ اور اس کے لئے پھل، مٹھائی وغیرہ روز لے کے آتے تھے۔ دھیرے دھیرے افسری بھی اُن سے مانوس ہو چلی....

ہم لوگوں کو بڑی حیرت تھی کہ آخر سکندر نے کسی بچے سے کیونکر سمجھوتہ کر لیا ہے۔ ایک دن میرا گزر باورچی خانے کی طرف ہوا تو سکندر کی آواز سُن کے ذرا کی ذرا میں باہر ہی رُک گئی ۔۔ سکندر کے ہاتھ میں ایک کاغذ کی پڑیا تھی، اس میں دو لڈو تھے۔ سامنے لڈو پہ نظریں جمائے افسری بیٹھی تھی۔ اور بار بار اس طرح زبان ہونٹوں پہ پھیر رہی تھی جیسے بھوکی بلی طشتری کے دودھ کی طرف دیکھتی ہے۔ سکندر بولے۔

"بٹیا لڈو کھائے گی؟"

افسری نے آگے بڑھ کے زور سے گردن ہلائی، اور اپنے ہونٹوں پہ زبان پھیری ۔ سکندر بولے ۔

" ہم یہ لڈو تیرے ہی لئے لائے ہیں ۔ لیکن . . . . ایسے نہیں دیں گے۔ بس ایک بار تو ہم کو ابّا کہہ دے ۔ . . . پھر یہ لڈو تیرے ہیں "

صرف اتنی سی بات کہنے میں بچی کا کیا نقصان تھا۔ اگر مٹھائی پانے کی یہی شرط تھی تو وہ سکندر کو کیا لڈو تک کو ابّا کہنے پر تیار تھی۔ اُس نے آگے بڑھ کے پُڑیا سکندر سے چھینتے ہوئے کہا ۔

" ابّا لڈو دے دے "

سکندر خوشی سے کھِل اُٹھے ۔ اپنے ٹیڑھے میڑھے سارے دانت باہر نکال دیئے ۔ اور لڈو انہوں نے بچی کے حوالے کر دیئے ۔

بچّی پڑیا لیتے ہی اُچک کے سکندر کی پہنچ سے دور ہو گئی اور ایک کونے میں کھڑی ہو کے زور زور سے کہنے لگی " تو ابّا نہیں ہے، تو تو چھیکندر ہے چھیکندر چھیکندر . . . چھیکندر . . . "

سکندر غصّے سے بے حال ہو کے آگے بڑھے کہ میں اندر داخل ہو گئی سکندر مجھے دیکھ کر پانی کے بلبلے کی مانند ایک دَم بیٹھ گئے ۔ اور حقّہ گڑگڑاتے لگے ۔

اسی زمانے میں عید کا تہوار آ گیا ۔ افسری کے اس واقعے کے بعد بھی سکندر مایوس نہیں ہوئے تھے ۔ اور اپنی سی کوشش میں لگے رہتے تھے۔ اور سغری کے جھڑکنے پھٹکارنے کے باوجود وہ سغری کی دلجوئی کرنے میں لگے

رہتے تھے ۔

عید کے دن صبح ہی سے سغری نے شوہر کی جدائی میں رونا پیٹنا شروع کیا ـــ غم کی ماری نے اپنے بالوں میں دھول ڈال لی ـــ اور اپنے شوہر کی ہر اس خوبی کو یاد کر کر کے رونے لگی جو اس بچارے مرے ہوئے آدمی پر سراسر بہتان تھی ۔

سکندر صبح ہی صبح چھٹی لے کر عید کی نماز پڑھنے بڑی شان سے گئے ۔ وہاں سے جب واپس ہوئے تو مردانے دروازے سے اندر داخل ہوئے ـــ اُنہوں نے کورے کورے کھڑکھڑاتے ہوئے کپڑے پہن رکھے تھے ۔ پاؤں کو کاٹتا ہوا ، چوں چوں کرتا ہوا نیا جوتا پہن رکھا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ سر پر کڑھی ہوئی ٹوپی تھی ـــ ہاتھ میں ایک دونا تھا ۔ اور اس میں افسری کیلئے گرما گرم مٹھائی تھی ـــ

سکندر بلا وجہ ہنستے ہوئے ایک دروازے سے گھر میں داخل ہوئے ، اور کرنا خدا کا کیا ہوا کہ اُن کے بالکل سامنے والے زنانے دروازے سے سغری کا شوہر مبارک اپنی خاکی وردی پہنے داخل ہوا ۔

سغری تو خوشی سے چیخ مار کے اس کی طرف دوڑی ـ

لیکن سکندر کے ہاتھوں سے ان کی گرما گرم مٹھائی کا دونا چھوٹ پڑا ان کا چہرہ ایک دم فق ہو گیا ۔ ۔ ۔ ۔ ہوش و حواس اڑ گئے ـ وہ ہاتھ جھاڑ کے اپنی جگہ پہ اس طرح ہکا بکا کھڑے ہو گئے جیسے انہوں نے کسی بھوت کو دیکھ لیا ہو ۔

کچھ دیر کے بعد جب سکندر کے ہوش وحواس بجا ہونے لگے تو وہ بھی مبارک کی طرف بڑھے وہاں افسری کھڑی تھی ۔ سکندر نے بچی پر کڑی نظریں ڈالتے ہوئے کہا۔

" اری چڑیل ! کیوں راستہ گھیرے کھڑی ہے ۔ چل دور ہٹ ادھر سے۔ کائے کو بھنک رہی ہے ۔"

اور مبارک سے بڑے اُداس لہجے میں انہوں نے صرف اتنا کہا۔

"یہاں تو خبر آگئی تھی کہ آپ خدانخواستہ ہو گئے "مرحوم" لیکن ... اب ہم آپ کو کیا سمجھائیں ۔"

⁂

سکندر فوج میں بھرتی ہوئے

مبارک کو ایک مہینے کی چھٹی ملی تھی۔ وہ کسی فوجی کینٹن میں بیرا ہو گیا تھا لیکن لڑائی اور فوج کے بارے میں ایسی ایسی باتیں کرتا تھا کہ سکندر دنگ رہ جاتے تھے۔ اور ایک دن جب مبارک نے سکندر کو یہ واقعہ سنایا۔

" فوج کا بھی عجیب حال ہے بھائی سکندر ...... ! وہاں تو ہر بات کا ڈھنگ ہی الگ ہوتا ہے ــــ اب یہی دیکھو کہ ایک چیز کہلاتی ہے پیراشوٹ "

سکندر ٹوکتے ہوئے بولے۔

" آں ہاں ــــ ہم جانتے ہیں اُسے ... وہ ہوائی جہاز سے اُترنے کی چھتری ہوتی ہے "

مبارک نے بڑے گمبیر لہجے میں کہا۔

" ایک دفعہ کیا ہوا بھائی سکندر کہ ہمارا جہاز سنگا پور کے اوپر اڑ رہا تھا ..... کچھ خطرہ دیکھ کے ہمارے افسر نے حکم دیا، فوراً اپنی اپنی چھتریاں کھولو اور نیچے کود پڑو۔ ہم لوگ جلدی جلدی چھتری کھول کے نیچے اُتر پڑے .... سنگا پور ہمیں بڑا خوب صورت شہر نظر آیا۔ بڑی رونق تھی وہاں ــــ ہم نے سوچا، ذرا دو ایک دن گھوم پھر لیں یہاں کہ بس اچانک افسر نے ہمیں حکم دیا کہ خطرہ ٹل گیا ہے ــــ کھول لو اپنی اپنی چھتریاں .... اور واپس اڑ جاؤ اپنی اپنی ڈیوٹی پر۔"

سکندر نے مبارک کی زبانی فوج کا جو اتنا حال سنا تو وہ خود بھی فوج میں بھرتی ہونے کی سوچنے لگے ـ پہلے تو انہوں نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا ـ پھر دوسرے نوکروں سے ذکر کیا ـ ہوتے ہوتے گھر والوں تک سکندر کے فوج میں بھرتی ہونے کے فیصلے کی خبر پہنچی ـ شروع شروع میں تو سب لوگ اس سلسلے میں سکندر کا مذاق اڑاتے رہے ـ لیکن چند دن بعد معلوم ہوا کہ سکندر واقعی سنجیدہ ہیں ـ اور اکثر وہ گھر سے غائب رہنے لگے ـ اور ہر روز علی گڑھ کے اُس پُرانے قلعے میں جانے لگے جہاں اُس زمانے میں اِدھر اُدھر سے بٹور کے فوجی بھرتی کئے جاتے تھے، اور وہاں ان کو فوجی ٹریننگ دی جاتی تھی ـ فوجیوں کی وردی سے وہ بہت مرعوب تھے اور صبح کے وقت جب سڑک پہ سے فوجیوں کے ٹرک گزرتے تھے تو سکندر بڑی حسرت سے ان کو دیکھتے تھے ـ

ہم لوگ ہر وقت ان کو ان کے ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کرتے تھے، اس لئے کہ ہمیں معلوم تھا کہ فوج کی زندگی اور اُس کی پابندی سکندر کے بس

کی چیز نہیں ہے۔ لیکن سکندر ایک دن کہیں سے ایک فارم بھروالائے، اور انہوں نے گھر آکے اطلاع دی کہ اب تو اُن کو خوشی خوشی فوج میں بھرتی ہونے کی اجازت دیدی جائے ورنہ وہ پھر خود ہی کہیں غائب ہوجائیں گے۔

نوبت یہاں تک پہنچی تو مجبوراً انہیں اجازت دے دی گئی۔ بلکہ ایک ملاقاتی کپتان پولیس سے سکندر کی بہادری، ہمت اور دلیری کی بھی بڑی تعریف کردی گئی — اور سکندر کو بڑی عزت سے رخصت کردیا گیا۔

آٹھ دس دن تک سکندر کی کوئی اطلاع نہ ملی۔ ایک دن کسی بچے نے بتایا کہ وہ فوجیوں کے ساتھ پریڈ کرتے ہوئے شمشاد بلڈنگ (یونیورسٹی کی مارکیٹ) میں دیکھے گئے ہیں۔ اسی شام کو سکندر ہم لوگوں سے ملنے گھر آئے تو فوجی وردی میں ملبوس۔ لیکن کسی بڑے سائز کے فوجی کی وردی انہیں دے دی گئی تھی۔ لہٰذا سکندر تو برائے نام نظر آرہے تھے۔ ہر طرف وردی ہی وردی نظر آتی تھی — سکندر نے ہم لوگوں کو فوجی سلام کیا۔ اور بڑے فخر سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ باورچی نظر آیا تو اُس سے بولے۔

" جا بھئی! تو چولہا جھونک، یہاں کیا کر رہا ہے کھڑا کھڑا "

کسی نے اُن سے پوچھا۔

" کیوں بھئی سکندر — فوج میں بھرتی ہو گئے ہو تم — اب تو خوش ہو۔"

سکندر ہنس کے بولے۔

" جی ہاں بہت خوش ہیں ہم اب تو "

"کیسی لگ رہی ہے فوج کی زندگی تمہیں ۔۔؟" میں نے پوچھا۔
سکندر بولے ۔۔" اور تو سب ٹھیک ہے بی بی ۔۔! بس ذرا جوتے کی مشکل ہے ۔"

"جوتے کی مشکل، کیا مطلب ہے بھئی!"

"وہ صاحب! بات یہ ہے کہ فوج میں ہمارے سائز کی کوئی چیز ہی نہیں ہے۔ وردی ہے تو۔ جوتا ہے تو۔ سب یا تو ہمارے ناپ سے بڑے ہیں یا چھوٹے۔ اب یہی دیکھئے نا ...." یہ کہتے ہوئے سکندر نے اکڑوں بیٹھے بیٹھے اپنے ایک پاؤں کو دونوں ہاتھوں سے سہارا دیتے ہوئے آگے بڑھایا اور بولے ۔۔

"یہ جوتا ہے؟ اس کو جوتا کہیں ہیں؟ ۔۔ ارے صاحب خدا جھوٹ نہ بلوائے تو ڈھائی ڈھائی سیر کا اس کا وزن ہے۔ نیچے یہ بڑی بڑی کیلیں الگ جڑی ہیں ۔ پھر بڑے سائز کا ہے تو بار بار ہمارا پاؤں اس میں سے نکلنے لگے ہے ۔۔! اور پھر صاحب حکم یہ ہے کہ دن بھر ہی وردی پہنے رہو، اور ساتھ میں ہر دم یہی جوتا چڑھائے رکھو ..... کسی وقت دل چاہے ہے کہ اپنا کرتا پاجامہ پہن کے چپل پاؤں میں ڈال کے گھومیں ۔۔ تو اجازت نہیں ہے صاحب اِس کی بھی .... جمعدار جی بڑے کڑوے مزاج کے ہیں۔ ہر بات پہ گالی دے بیٹھتے ہیں۔ کل ہم جرا دیر کو دوپہر میں کمر سیدھی کرنے کو لیٹ رہے تھے تو آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ سیدھے آکے ایک ہنٹر جڑ دیا انہوں نے۔ پھر بولے۔

"چل سیدھے سیدھے پریڈ ہو رہی ہے ۔"

"اب صاحب! سو کے اُٹھے تھے ہم۔ جرا تو وقت دیتے ہیں مُنہ ہات دھونے کا...... چار بجے تھے۔ چائے تک تو پینے کو ملی نہیں۔ فوراً کھڑا کر دیا لے جا کر لین ڈوری میں۔ ڈانٹ ڈانٹ کے کہنے لگے۔

"دایاں۔ بایاں۔

دایاں۔ بایاں"

اب صاحب یہ تو ہمیں معلوم تھا کہ فوج میں ٹانگوں کو دایاں اور بایاں کہتے ہیں۔ لیکن یہ یاد نہیں تھا کہ دایاں کونسا پاؤں ہے اور بایاں کونسا پاؤں ہے اب جانے کیا پھیر پڑ جاتا تھا، کہ جب جمعدار جی کہیں بایاں تو ہمارا "شاید" دایاں پاؤں اُٹھ جاتا تھا۔ اور جب وہ پکاریں دایاں تو ہمارا بایاں پاؤں بڑھ جاتا تھا۔ مشکل یہ تھی کہ ہمارے پیچھے جو "رنگروٹ" تھا وہ ہمیں دیکھ دیکھ کے پاؤں بڑھاتا تھا۔ اور اس کی دیکھا دیکھی اس کے پیچھے والا بھی ایسا کرتا تھا۔ بس صاحب قواعد میں جھگڑا پڑ گیا اور جمعدار جی ہماری جان کو آگئے۔ اور آگے بڑھ کے انہوں نے ہمیں اپنے بوٹ سے ٹھوکر ماری......

اور صاحب..... بوٹ بھی کیسا بوٹ...... کہ پانچ سیر وزن اس کا....

ہم نے اس مصیبت سے جان بچانے کے لئے جمعدار صاحب سے کہا کہ ہمیں بیچ میں کھڑا کرنے کی بجائے سب سے آگے کھڑا کریں، جب ہی معاملہ ٹھیک ہوگا۔ وہ مان گئے۔ اور ہمیں سب سے آگے کھڑا کر دیا اور لگے ڈانٹنے پھٹکارنے کہ دایاں، بایاں دایاں، بایاں۔ پھر صاحب ہم جلدی جلدی پاؤں آگے پیچھے کرنے لگے کہ انہوں نے چیخ کر پریڈ ہی رُکوا دی۔ اور ہمیں گالیاں دینے لگے کہ پوری لائن ہی

بگڑ گئی ہے اب کے تو ــــ تو ہم کیا کہیں صاحب... اس دائیں۔ بائیں نے بڑی مصیبت کر دی ہے ہماری "

اُس دن تو سکندر چلے گئے۔ لیکن تیسرے دن آئے تو بہت بجھے ہوئے تھے دردی ملگجی ہو چکی تھی۔ اور سکندر کے چہرے پر ایسی کمزوری تھی جیسے کسی بیمار کے چہرے پر ہوتی ہے۔ کراہ کے نیچے بیٹھ گئے اور بولے۔

" ارے صاحب! ہم باز آگئے اس فوج سے ..... کسی طرح ہماری جان بچ جائے اس سے ــــ ہم تو بڑی مصیبت میں پھنس گئے "

" کیوں بھئی کیا ہوا آخر؟ "

سکندر اُداسی سے بولے۔

" ایک بات ہو تو کہیں صاحب! وہاں تو ہر بات ہی اوندھی ہے ــــ ابھی دایاں بایاں ہی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کل ناشتے پہ جھگڑا ہو گیا۔ صبح صبح جو دلیہ ہمیں کھانے کو ملا، وہ ایسا تھا جیسا یہاں ہماری بھینس کو دیا جاتا ہے۔ جب ہم نے کہا۔

" یہ غذا آدمیوں کے کھانے کی ہے؟ "

تو جمعدار جی ہم پر برس پڑے۔

" فوج میں بھرتی ہوا ہے کہ بادشاہی تخت پر بیٹھا ہے "

کل جمعہ کا دن تھا۔ ہم نے جمعدار جی سے کہا۔

" آج تو ہم نہائیں گے، مسجد جائیں گے نماز پڑھنے اور شام کو برچھی بہادر رحمتہ کے مزار پر قوالی سُننے جائیں گے "

اِس پر جمعدار جی نے ایک موٹی سی گالی ہمیں دی اور کہا۔
"کیا پاگل خانے سے نکل کے آیا ہے ۔۔۔۔؟ یہ فوج ہے کہ راج محل ۔۔"
ہم پرسوں شام کو یوں ہی ذرا بیٹھے بیٹھے اپنے ساتھیوں کو مدار گیٹ والی بیلا بائی کا قِصّہ سُنانے لگے کہ کیسی آن بان والی عورت ہیں وہ، اور کیسے کو کین بھر وشی کرتے ہوئے پکڑی گئیں اور کیسے چھ مہینے کی جیل کاٹ کے آئیں اور کیا گلا پایا ہے انہوں نے کہ ۔۔۔۔ صاحب! بس اتنی جرا سی بات پر جمعدار جی نے آ کے شور مچا دیا۔ گالیاں دیں۔ ایک بید بھی ماری اور بولے ۔
"ابے تو یہاں ہمارے فوجیوں کو بگاڑ رہا ہے ۔۔ تجھے کس نے یہاں بھرتی ہونے کو بھیج دیا ہے ۔۔۔۔۔۔ تُو تو جا کے سیدھے سیدھے کسی کوٹھے پہ طبلہ تھاپ ۔"
آج صبح کہنے لگے ۔
"حکم آگیا ہے ۔ تیار رہو ۔۔ بس چار پانچ ہی دن میں یہاں سے کوچ کرنا ہوگا ۔"
ہم نے جمعدار جی سے پوچھا ۔
"جمعدار جی کہاں جانا ہوگا؟"
بس صاحب اتنی سی بات پہ بگڑ گئے۔ بولے ۔
"تجھے کیا۔ کہیں بھی جانا ہو ۔۔۔۔۔ ارے جہاں بھیجنا ہوگا وہاں بھیجد یئے جاؤگے ۔"
ہم نے کہا ۔" ہم یہ کیسے مان لیں جمعدار جی! ہم بھی بھلا کوئی مرغی

ہیں کہ انڈے ہیں کہ جہاں چاہا بھیج دیا۔ جب تک بتاؤ گے نہیں ہم تو کھسکنے کے نہیں یہاں سے۔"

لوگ باگ ہنسنے لگے تو جمعدار جی نے ہمیں پھر گالی دی اور بولے۔

"بکواس مت کرو تم یہاں ...... سیدھے سیدھے جانے کی تیاری کر لو۔"

ہم بھی اڑ گئے صاحب کہ۔

"ایسا قاعدہ تو نہ سنا نہ دیکھا۔ آدمی جہاں جاتا ہے، وہاں کا کچھ نام پتہ ہوتا ہے۔ ٹکٹ ہوتا ہے۔ یہ کیا کہ بس حکم دے دیا کہ چلنا ہے۔ ارے بھئی کہاں چلنا ہے؟ یہ تو بتا دو۔"

لیکن صاحب! فوج کی تو کوئی بات ہی ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔ جمعدار جی کو نہ بتانا تھا نہ بتایا انہوں نے کہ کہاں جانا ہے۔ جب ہم نے اُن سے کہا کہ ہم اپنے رشتہ داروں کو کہاں کا پتہ دیں تو انہوں نے کہا کہ تمہارا نمبر لکھ کے دے دیا جائے گا اُن کو .... اسی سے خط کتابت ہو سکتی ہے۔

"اب صاحب! ہم کوئی چور ہیں، اُچکے ہیں، جوتے ہیں کہ موزے ہیں جو ہمارا بھی نمبر ہوگا ......! پر صاحب وہ تو اپنی ہی بات پر اڑے ہوئے ہیں۔"

اسی طرح سکندر میاں پندرہ دن تک ہر دوسرے تیسرے دن آ کے اپنا دکھڑا سناتے تھے۔ پہلے تو ہم لوگ اُن کی اس دُرگت سے خوش ہوتے تھے

لیکن آخر میں جب اُن کی حالت واقعی بہت تباہ ہوگئی تو بڑی کوششوں، طرح طرح سفارشوں، اور میڈیکل سرٹیفکیٹ داخل کروا کے، اُن کو فوج سے چھٹکارا دلوایا گیا۔

سکندر فوج کے ذکر سے اب بہت بیزار ہو چکے ہیں۔

اور اس طرح ہندوستان کی فوج وطن کے اِس سورما، یعنی سکندر جیسے سپاہی کی خدمات سے محروم ہوگئی۔

*

سکندر کی شادی

سکندر فوج سے لوٹے تو کچھ دنوں تک بہت دل لگا کے کام کرتے رہے
دھیرے دھیرے کام کاج میں پھر ڈھیل دینے لگے۔ اور ایک دن کسی کام سے
بازار گئے تو ایک گھنٹے کے بجائے چار گھنٹے میں گھر لوٹے۔ گھر میں اس دن کوئی
دعوت وغیرہ بھی۔ مہمان آچکے تھے۔ مگر سکندر کا کوئی پتہ نہ تھا۔ اور کھانے پینے
کی وہ چیزیں بھی غائب تھیں جنہیں لینے سکندر بازار گئے تھے۔
گھر کی مالکن دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہی تھیں اور مہمانوں کو طرح طرح
کی باتوں میں مشغول رکھ رہی تھیں کہ خدا خدا کر کے میاں سکندر، لدے پھندے
اپنی سائیکل سمیت گھر میں داخل ہوئے۔
موقع ایسا تھا کہ اُن سے کچھ کہا نہیں جا سکتا تھا۔ جب مہمان وغیرہ چلے

گئے تو مالکن نے سکندر پر غصہ اُتارتے ہوئے کہا۔

" میں نے طے کر لیا ہے، کہ آج کے بعد سے تم سے بازار کا کوئی کام نہیں لیا جائے گا۔ تم نہایت کام چور آدمی ہو۔ اور کسی ڈھنگ کے کام کی تم سے توقع رکھنا انتہائی حماقت ہے۔ تم تو بس باربرداری (بوجھ ڈھونے) کے قابل ہو۔"

' باربرداری ' کا لفظ سن کے سکندر کا چہرہ غصہ سے لال پیلا ہو گیا۔ اور وہ بہت جھنجھلا کے بولے۔

" لو صاحب! اور سنو! چھ بیس سال سے ہم رات دن سب کی خدمت کر رہے ہیں۔ ہر دم۔ ہر گھڑی اس گھر کی بھلائی میں لگے رہتے ہیں، اور آپ کہہ رہی ہیں کہ ہم 'بربادی' کر رہے ہیں اس گھر کی! یہی بات ہے تو لیجئے اپنا گھر سنبھالیے۔ ہم تو جاتے ہیں۔

مالکن بھی اس دن غصے میں تھیں اس لئے فوراً ہی کہہ بیٹھیں۔

" تم آخر اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہو۔ کیا ہمارے گھر کا کام تمہارے بغیر چل نہیں سکتا۔ تم ایک منٹ میں یہاں سے جا سکتے ہو۔ اور آئندہ اس گھر میں کبھی قدم نہیں رکھنا۔"

سکندر بھی جانے کے لئے تیار ہو گئے۔ سیدھے اپنی کوٹھری میں پہنچے اور اپنا سامان وغیرہ باندھنے لگے اور مالی سے انھوں نے ایک رکشا لانے کے لئے کہا کہ گاڑی چھوٹنے میں صرف ایک گھنٹہ باقی تھا۔

علی گڑھ میں اُس زمانے میں نمائش ہو رہی تھی۔ سکندر کو ڈانٹ پھٹکار کر

سب گھر والے نمائش دیکھنے چلے گئے۔ اتفاق سے اُس دن بہت رات گئے جب ہم لوگ گھر لوٹے، تو دیکھا کہ سکندر صحن کے بیچوں بیچ پتھر کی چبوتری پر بیٹھے ہیں۔ اور اپنا مفلر سر سے لپیٹے ہوئے سردی سے کانپ رہے ہیں۔ اور ان کا سامان اُن کے پاس رکھا ہوا ہے۔

ہم لوگوں کو دیکھ کے اُٹھ کھڑے ہوئے لیکن تیور بتا رہے تھے کہ اب تک گھر والوں کی طرف سے اُن کا دل صاف نہیں ہوا تھا ... مالکن نے اُن دیکھا تو بولیں۔

"کیوں؟ گئے نہیں تم اب تک؟"

سکندر غصے میں کانپتے ہوئے بولے۔

"جانے کو کیا ہوا؟ — کیا ہم جا نہیں سکتے؟ کیا ہمارا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے؟ کیا ریل گاڑیاں بند ہو گئیں ہیں جو ہم جا نہیں سکتے!"

کسی نے پھر سکندر کو چھیڑا۔

"پھر گئے کیوں نہیں آخر؟"

اب سکندر آپے سے باہر ہو چکے تھے۔ گرج کے بولے۔

"آپ لوگوں کا کیا ہے۔ وقت دیکھتے ہیں نہ موسم۔ بس سب کو تفریح کی پڑی رہتی ہے۔ سب کے سب چل دیئے نمائش دیکھنے ... اور جو کاس کھُدا نہ خواستہ ہم بھی چلے جاتے اور ہمارا گھر کوئی لوٹ لے جاتا تو ... آپ لوگوں کا کیا جاتا!"

یہ فقرے سُن کے ہم سب کے سر شرمندگی سے جھک گئے اور خاموشی سے سب لوگ اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ مالکن کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ انہوں نے سکندر

کو ڈانٹ کے کہا۔

"کیوں سردی میں کھڑا کھڑا ٹھٹھر رہا ہے۔ باورچی خانے میں جا کے کچھ کھا پی اور اپنی کوٹھری میں جا کے مر۔ یہاں کیوں ہماری صورت پہ سوار ہے۔۔ بیمار ہو جائے گا تو گھر کا کام کون کرے گا؟ کام چور کہیں کا!"

ابھی تھوڑے دنوں کی بات ہے سکندر کے وطن سے اُن کے نام ایک خط آیا۔ سکندر کو اپنی ڈاک کا بہت انتظار رہتا ہے۔ اور ہفتے دس دن میں اُن کے نام ضرور ایک آدھ خط اُن کے گھر سے آجاتا ہے۔۔۔ عجیب بات یہ ہے کہ چوبیس سال کی مدت میں اُن کے نام جتنے خط آئے ہیں، اُن سب کا مضمون تقریباً یکساں ہوتا ہے۔ صرف بھیجنے والے کے نام میں کبھی کبھی فرق ہو جاتا ہے۔ ہر خط میں سکندر سے کوئی نہ کوئی فرمائش یا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ کسی نہ کسی کا قرضہ چکانا ہوتا ہے۔ لڑکی کی شادی کے لئے پیسوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ علاج کے لئے رقم درکار ہوتی ہے۔ گھر کی مرمت کے لئے پچاس ساٹھ روپیوں کا سوال ہوتا ہے۔ آج تک اُن میں سے کوئی سکندر کے کام نہیں آیا ہے۔ کسی نے سکندر کی کبھی کوئی مدد نہیں کی۔ سکندر کو وطن جانے پر کسی نے مہمان نہیں رکھا بلکہ اُلٹا سکندر سے لے لے کے گھر کا خرچ چلایا ہے۔۔۔۔ لیکن سکندر ہیں کہ سب پر جان چھڑکتے رہتے ہیں۔ ہر سال محرم کے زمانے میں دس دن کی چھٹی لے کے اپنے وطن بدایوں جاتے ہیں۔ اور جو کچھ بھی جمع پونجی قرض لی گئی یا پیشگی تنخواہ ہوتی ہے، سب اپنے ان خود غرض رشتہ داروں پر خرچ کر آتے ہیں۔ ہم میں سے کوئی اگر سمجھانے کی کوشش کرتا ہے تو بہت برا مانتے ہیں اور کہتے ہیں "صاحب! ہم تو

اپنے ماں باپوں کو چھوڑیں گے نہیں !"
یہ ماں اور باپوں کا لطیفہ بھی کم دلچسپ اور عبرتناک نہیں ہے۔ سنا ہے جب سکندر پیدا ہوئے تو اُن کے ماں باپ دونوں زندہ تھے۔ کچھ عرصہ کے بعد سکندر کی ماں کا انتقال ہو گیا۔ اور اُن کے باپ نے کسی عورت سے شادی کرلی، جسے سکندر ماں کہنے لگے۔ عجیب اتفاق کہ آٹھ دس سال کے بعد سکندر کے والد بھی چل بسے اور اُس عورت نے کسی اور آدمی سے شادی کرلی..... اور سکندر اس آدمی کو باپ کہنے لگے ! — لاکھ لاکھ سمجھاؤ کہ بھئی تمہارے لئے یہ دونوں عورت اور مرد قطعاً اجنبی ہیں۔ لیکن سکندر کسی طرح یہ ماننے پہ تیار نہیں ہوتے ہیں کہ ان کے "ماں باپوں" میں کوئی گڑبڑ ہے۔
ان دونوں ماں باپوں نے بھی سکندر کو لوٹنے کی قسم کھا رکھی ہے سکندر کی پوری کمائی انہیں کے حصے میں آتی ہے۔ ایک دفعہ میں نے سکندر کو بہت سمجھانے بجھانے کی کوشش کی اور اُن سے کہا۔
"تمہارے یہ سارے رشتے دار بڑے خود غرض اور ٹیڑھے قسم کے ہیں اپنی تمام ضرورتیں تم سے پوری کرالیتے ہیں۔ اور وہ تمہاری شادی تک کہیں نہیں کراتے ہیں....."
چونکہ شادی کا ذکر آپڑا تھا، لہٰذا سکندر کے دل کو یہ بات لگ گئی اور اُنہوں نے ایک ہفتے کی چھٹی لے کے اپنے گھر جانے کی ٹھانی اور ہم لوگوں سے کہہ گئے
"اب کی بار تو ہم ضرور ہی شادی کر کے اور "ان کو" ساتھ لے کے

لوٹیں گے۔"

جب ایک ہفتہ گزر گیا اور سکندر نہیں لوٹے۔ تو سب کو بڑی فکر ہوئی کہ آخر ہوا کیا سکندر تو اس معاملے میں بڑی پابندی کے قائل تھے۔ چھٹی لے کے ایک دن بھی زیادہ نہیں رکتے تھے۔ آٹھویں دن سکندر کا ایک ہموطن چپراسی آیا اور اُس نے ایک لفافہ دیا جو سکندر نے اُس کو دیا تھا کہ گھر جا کے مالکن کو دے آئے۔

خط کھولا گیا تو اس میں درج تھا۔

"بیگم صاحب۔ ہم کو بڑا افسوس ہے کہ ہم وقت پر گھر نہیں پہنچ سکیں گے۔ یوں کہ آپ کی دعا سے ہمارے ماں باپوں نے یہاں ایک جگہ ہمارے رشتے کی بات چیت چلا رکھی ہے۔ آج لڑکی والوں نے ہم کو اپنے گھر بلایا ہے، دیکھنے کو ہم خود بھی چاہتے ہیں کہ اس دفعہ یہ ہماری شادی کا رگڑا (جھگڑا) ضرور ختم ہو لے۔ ہم اپنے دوست کے ہاتھوں یہ گستی (دستی) خط بھجوا رہے ہیں۔"

اس خط کے چوتھے دن کے بعد سکندر بے حد خوش و خرم گھر میں داخل ہوئے...... سب گھر والوں نے اُن کو گھیر لیا۔ یہ سوچ کر کہ سکندر بیاہ کر آئے۔

کسی نے پوچھا "کیوں سکندر آگئے؟"

بولے "ہاں۔ ہاں ہم آگئے۔"

ایک بچے نے آگے بڑھ کے پوچھا "تمہاری شادی ہو گئی سکندر؟"

سکندر نے جذبات سے خالی لہجے میں جواب دیا۔
" نہیں، شادی تو نہیں ہوئی ہماری "
" ارے ــــ رے ......رے...... اس بار بھی تم کنوارے کے کنوارے لوٹ آئے ــــ ...... بھئی تم نے تو اپنے گستی خط میں لکھا تھا کہ تم بَر دِکھوا کو جا رہے ہو! "
سکندر نے اطمینان سے پتھر پر بیٹھتے ہوئے کہا۔
" بات ذرا لمبی ہے ...... بیگم صاحب! فرصت سے سنائیں گے ہم اِس قصّے کو "
لیکن ایسا دلچسپ قصہ سُننے کے لئے فرصت کا انتظار کسے تھا۔ سب لوگ سکندر سے اصرار کرنے لگے کہ پورا پورا حال ابھی سُنا دیں۔
سکندر بھی اب قصہ سنانے کے موڈ میں آچکے تھے کہنے لگے ــــ
" صاحب ــــ! ہمارے پڑوس میں ایک منشی جی رہتے ہیں۔ اُن کی دو بیٹیاں ہیں ــــ ایک بیٹی اپنے گھر میں خوش ہے ــــ اور اپنے آدمی کے ساتھ پاکستان میں رہتی ہے ــــ دوسری بیٹی یہیں ہاتھرس میں بیاہی گئی تھی۔ اس کا گھر والا ٹھیک آدمی نہیں تھا۔ اور سسرال والے بھی اچھے نہیں تھے... اسلئے وہ لڑکی اپنے میکے آکے رہتی تھی ــــ اور اس نے صاف صاف اپنے ماں باپوں سے کہہ دیا تھا کہ اگر اُس کو دوبارہ اُس کی سسرال بھیجا گیا تو وہ اپنی جان کی گھُس کھُسی (خودکشی) کرلے گی۔ اب پانچ سال سے وہ اپنے میکے میں بیٹھی تھی اس کا آدمی بار بار اس کو لینے آتا تھا۔ لیکن اُس کے ساتھ جانے سے اُس نے

صاف انکار کر دیا تھا۔ اُس کے میکے والوں نے سوچا کہ کہیں دوسرا گھر اس کے لئے دیکھا جائے۔ انہیں اچھے داماد کی تلاش تھی کہ ہمارا تذکرہ چھڑ گیا۔ ہمارے ذکر پر سنتے ہیں وہ کچھ کچھ راضی ہونے لگی تھیں۔ انہوں نے یہ شرط رکھ دی تھی کہ اب کی دفعہ وہ اندھے کنویں میں نہیں گرینگی، بلکہ دروازے کی آڑ سے خود بھی "لڑکے" کو دیکھیں گی ــــ ہمیں یہ رودگار (روداد) معلوم ہوئی، تو ہم نے کہا کہ ہمیں انکی یہ شرط بھی منجور ہے۔

اسی دن شام کو ہم ان کے گھر پہنچے ــــ وہاں ہماری بڑی آؤ بھگت ہوئی شربت پلایا گیا اور اُن کے چچا نے ہم سے کہا

"آپ کھاطر جمع رکھیں۔ شاید آپ کی قسمت کھُلنے والی ہے اور شاید ہم آپ کو اپنی گلامی (غلامی) میں لینے والے ہیں"۔

ہم یہ سُن کے اپنے گھر چلے آئے۔ دوسرے دن جب سارا دن گزر گیا، اور شام بھی بیتنے لگی تو ہم "اُن" کے گھر پہنچے۔۔۔۔۔۔ وہاں جاکے پتہ چلا کہ ہمارے آنے کے بعد سے جو "اُنہوں نے" رونا شروع کیا تو رات بھر روتی رہیں اور صبح سویرے اُٹھ کے، رکھشا منگوا کے اپنے شوہر کے گھر چلی گئیں!"

ہم سب کا مارے ہنسی کے بُرا حال تھا۔ میں نے کہا۔

"واہ سکندر واہ۔۔۔۔۔ یہ بھی خوب ہوا۔۔۔۔ تمہیں تو اس قصے سے بڑا دُکھ ہوا ہوگا ــــ!"

سکندر نے ذرا سا پہلو بدلا۔ کچھ مایوسی سی اُن کی آنکھوں میں جھلکی لیکن وہ بڑے ٹھہراؤ سے بولے "دُکھ کی کیا بات ہے بی بی! ہم تو بہت خوش ہیں کہ ہماری

وجہ سے کسی کا گھر تو بس گیا۔"

اتنا کہہ کر سکندر آہستہ آہستہ چل کے پانی کے نل کی طرف گئے اور جوتے اُتار کے، اُکڑوں بیٹھ کے سر جُھکا کے اپنے پاؤں دھونے لگے۔ جیسے اب اُن کی زندگی میں یہی ایک اہم کام باقی رہ گیا ہو۔

٭

تمام شُد